جون ۸۲

۱۴۰۲
۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ

الرشید

جلد ۳ شمارہ ۸

ماہِ جون ۱۹۸۲ء شعبان ۱۴۰۲ھ

ماہنامہ المرشد چکوال (جہلم)

دینی اخلاقی اور علم سلوک اور تصوف کا واحد مجلہ

اس شمارہ میں

اداریہ	مدیر اعلیٰ
اسرار التنزیل	حضرت مولانا محمد اکرم صاحب
چراغ مصطفوی	حافظ عبدالرزاق صاحب ایم اے
دین اسلام	جناب شیخ محمد حبیب الرحمان صاحب بیرسٹر (انڈیا)
سادہ زندگی	(ادارہ)
پیغمبر اسلام کی شادیاں	جناب پنڈت سندر لال استاد دہلی (انڈیا)
ایک خط اور اس کا جواب	حافظ عبدالرزاق صاحب
ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی	ترتیب حافظ عبدالرزاق صاحب
خدایا ایں کرم بارِ دگر کن	حافظ عبدالرزاق صاحب

سرپرست اعلیٰ

حضرت العلام مولانا اللہ یار خان صاحب مدظلہ

مدیر مسئول:

حافظ عبدالرزاق ایم اے عربی اسلامیات

مجلس ادارت (اعزازی)

- پروفیسر ضیاء حسین نقوی بی اے آنرز ایم اے
- مولانا محمد اکرم صاحب منارہ (جہلم)
- پروفیسر باغ حسین کمال ایم اے

بدل اشتراک

زر سالانہ	۳۵ روپے
ششماہی	۱۸ ″
فی کاپی	۳ ″

سول ایجنٹ

مدنی کتب خانہ

گنپت روڈ لاہور

حافظ عبدالرزاق پبلشر نے جناب منہاج الدین اصلاحی شرکت پرنٹنگ پریس نسبت روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ المرشد الحسنات منزل چکوال ضلع جہلم سے شائع کیا ہے۔

اداریہ

انسان کو زندگی کے مختلف مراحل سے گذرنا پڑتا ہے ہر دور کے تقاضے جداگانہ نوعیت کے ہوتے ہیں بچپن میں اس کی ذہنی اور جسمانی قوتیں نشو و نما پاتی ہیں اور روبہ ترقی ہوتی ہیں اسے ذمہ داریوں کا کوئی احساس اور شعور نہیں ہوتا۔ رفتہ رفتہ وہ جوان ہوتا ہے جوانی کے زمانے میں اس کی تمام صلاحیتیں پورے جوبن پر آتی ہیں۔ اعضاء و جوارح قوی ہو جاتے ہیں قلب و دماغ میں جوش اور اُمنگ ہوتی ہے ذمہ داریوں کا احساس اور شعور پیدا ہوتا اور بڑھتا ہے۔ اور وہ زندگی کے ہر میدان میں افتاد طبع اور ماحول کے مطابق جولانیاں دکھاتا ہے اس انتہائی عروج کے بعد انحطاط اور زوال شروع ہو جاتا ہے اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں قوی مضمحل ہونے لگتے ہیں اور وہ زبان حال سے گنگنانے لگتا ہے ؎

جوانی ہے تو ذوق دید بھی لطف تمنا بھی ٭ ہمارے گھر کی آبادی قیام مہماں تک ہے

رفتہ رفتہ قوتیں جواب دینے لگتی ہیں۔ آج بینائی کمزور ہو رہی ہے کل سماعت جواب دے رہی ہے بازوؤں میں وہ طاقت نہیں کل جن ٹانگوں سے دوڑتا اور دندناتا پھرتا تھا آج ان سے قدم اٹھانا محال ہو رہا ہے مگر اس سارے انحطاط کے باوجود زبان ایک ایسا عضو ہے کہ اسی طرح چل رہی ہے بلکہ یوں لگتا ہے کہ اسکی ساری قوتیں سمٹ کر زبان میں جمع ہو گئی ہیں۔

فرد کی طرح قوموں پر بھی یہی مراحل آتے ہیں قومیں جب وجود میں آتی ہیں تو ان میں تنظیم، اجتماعیت ضبط و نظم پیدا ہوتا اور ترقی کرتا ہے اجتماعی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے شوق عمل بلکہ جوش عمل کا دور دورہ ہوتا ہے قومی اخلاقیات کے ضابطے بنتے ہیں باہمی معاملات میں ان اخلاقی قدروں کا بھرپور اظہار ہوتا ہے علمی تحقیق، فنی ترقی اور عملی میدان میں اپنا مقام پیدا کر لیا جاتا ہے یہ دور قوموں کی جوانی کا زمانہ ہوتا ہے پھر جوانی ڈھلنا شروع ہوتی ہے عملی قوتیں ماند پڑ جاتی ہیں۔ اخلاقی قدروں کا احساس کم ہونے لگتا ہے معاملات میں وہ احتیاط باقی نہیں رہتی۔ سہل انگاری اور عیش کوشی کی طرف میلان ہونے لگتا ہے۔ تصنع، بناوٹ نمود و نمائش بناؤ سنگار پر وقت اور دولت صرف ہونے لگتی ہے۔ اور کوئی اہل دل کہہ اُٹھتا ہے ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر اُمم کیا ہے ٭ شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

مگر بایں ہمہ فرد کی طرح قوم کی ساری قوتیں سمٹ کر زبان میں آجاتی ہیں۔ اور بیان بازی ایک قومی مشغلہ نہیں بلکہ زندگی کا اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے۔

تاریخ اقوام نے مختلف قوموں کے ایسے انقلابات بڑی دیانتداری سے محفوظ رکھے ہیں۔ اپنی قوم کو ہی دیکھیئے محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی شیرازہ بندی کی زندگی کے اصول و قواعد دئیے اصلاح ذات اور تعمیر غیر کے سلیقے سکھائے اور چند برسوں میں جنہیں قوموں کی زندگی میں چند لمحے ہی کہا جا سکتا ہے اس قوم کو ترقی کی اس معراج تک پہنچایا کہ اس عظیم انقلاب کا اجمالی نقشہ یوں سامنے آیا کہ ؎

دُرفشانی نے تری قطروں کو دریا کر دیا ⁂ دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے ⁂ کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

جوں جوں اُس دور سے بُعد ہوتا گیا۔ قوم نے اپنے اس عظیم محسن سے ایک جذباتی لگاؤ رکھنے کے باوجود ذہنی، اخلاقی اور عملی طور پر اس کو بھلا دینے کا عمل شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ قوم نے اس محسن اعظم کے دئیے ہوئے اُصولوں کے خلاف منظم طور پر احتجاج شروع کر دیا حتیٰ کہ قوم کی صنف نازک بھی پورے اہتمام سے احتجاج مجسم بن کر سڑکوں پر نکل آئی کہ ہمیں انسانیت کا درس کیوں دیا جاتا ہے۔ ہماری عزت و آبرو عفت و عصمت کی حفاظت کے لیئے وہ فرسودہ اصول ہمارے سامنے کیوں پیش کئے جاتے ہیں جو اُس محسن انسانیت نے سکھائے اور اپنے سامنے ان پر عمل کرا کے ایک مثالی معاشرہ قائم کیا جس کی نظیر انسانی تاریخ میں ڈھونڈے نہیں ملتی یہ سب کچھ ہونے لگا مگر قوم نے بیان بازی میں وہ نام پیدا کیا کہ شاید ہی کہیں اس کی مثال مل سکے سٹیج پر اخلاقیات کے درس دئیے جاتے ہیں عملی زندگی میں اخلاق کا لفظ ہی لغت سے خارج کر دیا گیا ہے۔ جلسوں میں دیانت و ایثار کے موضوع پر مقالے پڑھے جاتے ہیں عملی زندگی میں رشوت اور لوٹ کھسوٹ کا کاروبار زوروں پر ہے اخباروں میں جوشِ عمل اور جوشِ کردار پر ابھارنے کے لیئے مضامین دئیے جاتے ہیں۔ عملی زندگی میں سارا زور اور اکثر وقت ناچ گانے میں صرف ہوتا ہے اور ناچنے تھرکنے، گانے بجانے کے ماہر فنکاروں کو اعزازات سے نوازا جاتا ہے یہ تھوڑی خدمت ہے کہ آنکھوں اور کانوں کے راستے یہ مارفیا کے انجکشن اور تھپکیاں دے دے کر قوم کو گہری نیند سلائے رکھنے کا اہتمام کیا جا رہا ہے بیانوں میں ہزار سال لڑنے کے عزم مصمم کا اظہار ہے تو میدان میں ہزار گھنٹے تک کی فکر نہیں۔ قومی کردار میں یہ تضاد یہ دو رنگی آخر کیوں ہے؟ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ قوم محسنِ انسانیت سے عہد کر کے مکر گئی پیمان وفا باندھ کے بڑی بے باکی سے اسے توڑ دیا اس بد عہدی اور بے وفائی کا نتیجہ اس کے سوا کیا نکل سکتا تھا۔ مگر اس کا علاج؟ صرف ایک ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

"مدیر"

حضرت مولانا محمد اکرم صاحب

اسرار التنزیل

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ وسلامٌ علیٰ سید المرسلین وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین

اما بعد فقال اللہ تعالیٰ حٰمٓ عٓسٓقٓ:

یہ سورۃ مکی ہے۔ اور مکی زندگی مشکلات سے عبارت ہے۔ کفار کا طرزِ عمل انتہائی حوصلہ شکن اور ان کی گستاخیاں ناقابلِ برداشت تھیں۔ اللہ کریم نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا "کہ اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سنت اللہ اسی طرح ہے کہ انبیاء کو مبعوث فرما کر احکام بذریعہ وحی ان کو بھیج دیتا ہے، ورنہ تو وہ بہت غالب ہے کسی کی کیا مجال ہے کہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکے مگر یہ اس کی حکمت ہے کہ اس نے مخلوق کو تعلیماتِ نبوی ماننے یا نہ ماننے کا اختیار بخش دیا ہے۔

"چمن اپنے لئے پھول یا خار تو"

اگر یہ اس کی حکمت نہ ہوتی تو کون سرتابی کر سکتا تھا جبکہ جو بھی زمینوں اور آسمانوں میں ہے ان سب کا واحد مالک تو وہی ہے جب ہر شے اس کی ملک ذاتی ہے اور اس کی ذات بہت ہی عالی اور بہت بڑی ہے تو اگر حکماً اطاعت کرانا چاہتا تو کون سرتابی کر سکتا تھا۔

اب رہی دوسری بات کہ ہر ایکشن کا ایک ری ایکشن ہوتا ہے ہر فعل کے نتیجہ میں اثر مرتب ہوتا ہے تو جیسے کہ کوئی یا شرک و کفر اس قدر ہے کہ تعلیماتِ نبوی کی کوئی پرواہ نہیں کرتا تو اس کے ری ایکشن کے طور پر تو دنیا کو تباہ ہو جانا چاہیئے پھر یہ آسمان کس طرح قائم ہے اور زمین کیوں سبزے اگل رہی ہے کہ عبادت کی مثال اگر ابرِ رحمت کی ہے تو گناہ یقیناً آگ کی تاثیر رکھتا ہے اور جب کثرت اور غلبہ گناہ کو حاصل ہے تو اس کا نتیجہ کیوں مؤخر ہے۔ اور مخلوق کس سبب سے فرصت پا رہی ہے اور کونسی وجہ ہے کہ زمین و آسمان قائم ہیں فرمایا اس بیلنس کو قائم یا اس ترازو کو پورا رکھنے کے لئے اس قدر کثرت سے فرشتوں کے لشکر عبادت پہ لگا دیئے ہیں گویا آسمان کی کمران کے بوجھ سے جھک گئی ہے اور یہ صرف وہ فرشتے ہیں جو تسبیح و تحمید میں لگے ہوئے اپنے عمل سے بھی اہل زمین کے لئے طلب مغفرت کا سبب بنے ہوئے ہیں اور مغفرت طلب بھی کرتے ہیں اور دیکھو اللہ جل شانہٗ کس قدر بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے کہ بنی آدم کے اعمال تو بہت پہلے ہر شے کو تباہ کر دیتے مگر اس کی بخشش و رحمت نے

عمومی تباہی سے ان کے بچنے کا اہتمام فرما دیا کہ زمین و آسمان آپس میں ٹکرا کر چور چور نہیں ہوتے۔ اس فرصت میں چاہیے تو تھا کہ لوگ توبہ کرتے اور اطاعت شعار بن جاتے مگر ان کم عقلوں نے یہ موقع کھو دیا جبکہ موت کی تلوار ان کے سر پر لٹک رہی ہے یہ غیر اللہ کی اطاعت اور دوستی کا دم بھرتے ہیں اور اللہ کریم کے مقابلہ میں جس نے ان کی حفاظت کن کن طریقوں سے فرمائی ہے غیر اللہ کی اطاعت کرتے یہ لوگ اللہ کے علم میں ہیں اور وہ انہیں خوب جانتا ہے آپ اپنے دل کو غمگین نہ کریں۔ آپ ان کے افعال کے ذمہ دار نہیں ہیں آپ نبی ہیں آپ نے حکم الٰہی پہنچا دیا آپ کا فرض ادا ہو گیا اس کے بعد معاملہ براہ راست خالق اور مخلوق کے درمیان ہے آپ کی ذمہ داری پوری ہو گئی

اسی طرح ہم نے قرآن عربی کو آپ پر نازل فرمایا کہ آپ مکہ اور اس کے گرد اگرد کی ساری خدائی کو ڈرائیں نافرمانی کے ثمرات سے یعنی قرآن کا نزول ہی صرف نبی پر نہیں ہوا بلکہ قرآن کا بیان کرنا بھی منصب ہے اگر کوئی اپنی طرف سے معانی بیان کرتا ہے تو وہ ہرگز قابل قبول نہیں قرآن کا مفہوم بتانا صرف وہ حق ہے جو حضور اکرم ﷺ سے ثابت ہے اور تعامل صحابہ سے جو شاگرد رسول ﷺ کا درجہ رکھتے ہیں۔

سب سے پہلے یہی جگہ بنی جہاں کعبۃ اللہ ہے پھر یہاں سے ساری زمین بچھائی گئی تو اس لحاظ سے یہ ام القریٰ ہوا اور ساری زمین اس کا ماحول، تو فرمایا آپ کا منصب آپ کا فریضہ اہل مکہ سے شروع فرما کر ساری زمین پر تعلیم وحی الٰہی کا عام کرنا اور برائی کے انجام سے آگاہ کرنا ہے اور اس دن کی ہولناکیوں سے اطلاع دینا ہے جس دن سب کو جمع کیا جائے گا اور جس کے وقوع میں کوئی شبہ نہیں۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس دن صرف دو گروہ ہوں گے حکومت صرف ایک۔ اور گروہ دو، حکومت اللہ کی اور ایک گروہ جنت میں جانے والوں کا اور دوسرا دوزخ کے مکینوں کا۔ اب اگر دنیا میں ہزار طرح کی گروہ بندی ہو مگر اصلاً دو ہی طرح کے لوگ ہیں یا اطاعت شعار یا نافرمان تو وہاں صرف دو گروہ دو فریق دو ٹولے یا دو پارٹیاں ہوں گی ایک جنت میں داخل ہوگی اور دوسری دوزخ میں۔ اب اگر خدا سب کو جنت میں بھیج دیتا اور سب پر رحمت کرتا اور دو کی بجائے ایک ہی جماعت ہوتی تو وہ قادر ہے کر سکتا تھا مگر جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل فرمائے جو رحمت باری سے محروم ہیں اس کا باعث ان کا ظلم ہے، ان کی غلط کاری ہے۔ ان کا کفر و شرک ہے ان کا فسق و فجور ہے ظلم ہوتا ہے وضع شیٔ فی غیر محلہ۔ کوئی غلط کام ظلم ہے اور مسلسل گناہ سے ظلم ترقی کرتا ہے حتیٰ کہ نوبت کفر اور شرک پر پہنچتی ہے اور شرک ظلم عظیم ہے۔ ظالم انسان کو رحمت باری سے محروم کر کے بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے۔ ظالم شخص پہرہ کے سائے میں بھی لرزتا رہتا ہے اس کا دل گواہی دیتا ہے کہ دنیا میں تیرا کوئی خیر خواہ نہیں نہ صرف میدان حشر میں بلکہ ظالم کو دنیا میں بھی اندھیری نظر آتا ہے اور اس کی بے کلی بڑھتی ہی رہتی ہے یہی بات ایران کے اس قاصد نے کہی تھی جو دربار خلافت میں حاضر ہوا تو کسی سے پوچھا شاہی محل کس طرف ہے کیونکہ مدینہ منورہ تو بستی تھی تو اس نے کہا یہاں بادشاہ ہی نہیں تو شاہی محل کا کیا کام! ہم میں تو امیر ہوتا ہے کہنے لگا اسی کا پتہ دو کیا مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ہوں گے وہاں نہ ملے تو کسی کے ساتھ تلاش کرتے ہوئے شہر سے باہر دیکھا اسلام کا طبل جلیل۔ حضرت فاروق اعظمؓ ریت پر قیلولہ کر رہا ہے اور دھوپ کی

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

پروفیسر حافظ عبدالرزاق صاحب
ایم۔ اے اسلامیات

چراغِ مصطفویؐ

۱۔ عن ابی ھریرۃؓ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن اللہ تبارک وتعالیٰ انا عند ظن عبدی بی وانا معہ اذا ذکرنی فان ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی وان ذکرنی فی ملاء ذکرتہ فی ملاء خیر منہ

(متفق علیہ)

ترجمہ۔ حضورؐ نبی کریم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالٰے نے فرمایا میں بندہ کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتا ہوں جیسے وہ میرے ساتھ گمان رکھتا ہے اور جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں اگر وہ اپنے دل میں مجھے یاد کرتا ہے تو میں بھی اپنے دل میں اسے یاد کرتا ہوں اگر وہ کسی جماعت میں مجھے یاد کرتا ہے تو میں بھی اس جماعت سے بہتر جماعت (فرشتوں) میں اُسے یاد کرتا ہوں۔"

اس حدیث قدسی میں چار امور کا ذکر ہے۔ اول یہ کہ انسان اپنے ربِ کریم کے متعلق جس قسم کا عقیدہ رکھتا ہے اللہ تعالٰے اس کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بندے کو رب کریم کی نعمتوں کا احساس رکھتے ہوئے ہمیشہ اس کا شکر گزار رہنا چاہیئے۔ جو لوگ کم فہمی یا کج فہمی سے اللہ تعالٰے کے فیصلوں اور اس کی حکمتوں کے خلاف شاکی ہوتے ہیں وہ اپنے رب کو پہچانتے ہی نہیں اور ان کا سب معاملہ اللہ کے ساتھ کھرا نہیں ہوتا۔

دوم: اللہ تعالٰے کا ذکر کرنے والے کو اس کی معیت حاصل ہوتی ہے جسے اللہ کی معیت حاصل ہو اس سے زیادہ خوش قسمت کون ہو سکتا ہے اور جس عمل کی وجہ سے انسان کو یہ شرف حاصل ہو اس عمل کی عظمت اور فضیلت کا کیا کہنا۔

سوم: جو شخص اللہ تعالٰے کو دل میں یاد کرتا ہے اللہ تعالٰے ذاتی طور پر اسے یاد کرتا ہے۔ یعنی یہ ذکر قلبی کا ثمرہ ہے گویا یہ حصہ فاذکرونی اذکرکم کی تشریح ہے۔

چہارم: جو شخص کسی جماعت میں اللہ کو یاد کرتا ہے اللہ تعالٰے اسے اس جماعت سے بہتر جماعت یعنی ملائکہ مقربین میں اس کو یاد کرتا ہے یعنی حلقۂ ذکر کا یہ فائدہ ہے کہ فرشتوں کی جماعت میں ذاکرین کا چرچا ہوتا ہے۔

اس سے ذکر الٰہی کی اہمیت، فضیلت اور فائدے کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

۲۔ عن ابی موسیٰ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل الذی یذکر ربہ والذی لا یذکر ربہ مثل الحی والمیت (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنے رب کا ذکر کرتا ہے اور جو ذکر الٰہی نہیں کرتا ان کی مثال ایسی ہے جیسے زندہ اور مردہ۔

حدیث کی عبارت میں لف ونشر مرتب ہے یعنی جو ذکر الٰہی کرتا ہے وہ زندہ آدمی کی مانند ہے اور جو ذکر نہیں کرتا وہ مردہ کی مانند ہے۔ زندہ اور مردہ میں فرق کسی سے مخفی نہیں۔ زندہ آدمی اپنی بقا اور نشوونما کے لیے ہر طرح کوشش کرتا ہے جسمانی صحت ذہنی اور عقلی قوتوں کو نور علم سے آراستہ کرتا ہے اور روحانی صحت کے لیے احکام الٰہی کی تعمیل کرتا ہے اور اپنی ذات اور صلاحیتوں کو معاشرے کی بہتری کے کاموں پر لگاتا ہے گویا وہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے ایک مفید فرد ہوتا ہے۔

اسی طرح جو شخص ذکر الٰہی کرتا ہے وہ ظاہر کے اعتبار سے اپنے اعضاء اور قوتوں کو اطاعت الٰہی میں صرف کرتا ہے اور اپنے باطن کو نور معرفت سے منور کرتا ہے اور دوسروں کے لیے ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ بنتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں مردہ آدمی نہ اپنی ذات کے لیے نفع و نقصان کا مالک ہوتا ہے نہ اس کو اس کا احساس یا ادراک ہوتا ہے نہ دوسروں کے لیے کسی درجے میں کارآمد ہوتا ہے اس کا مقام زیر زمین ہوتا ہے اور وہ سب آنکھوں سے اوجھل کر کے قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے۔

اسی طرح جو شخص ذکر الٰہی نہیں کرتا نہ وہ اپنا خیر خواہ ہے نہ دوسروں کا اس سے کسی کو کوئی حقیقی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ یہ تو مردے سے بھی بدتر ہے کیونکہ وہ اپنی ذات کا دشمن بھی ہوتا ہے اور دوسروں کے لیے گمراہی کا نمونہ بن جاتا ہے وہ بظاہر زندہ نظر آتا ہے مگر اس کا قلب اور اس کی روح مردہ ہوتی ہے اور یہ جسم اس کی روح کا مدفن ہوتا ہے۔

اس مثال سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ حقیقی حیات تو ذکر الٰہی کا نام ہے کیونکہ یہ اس ذات کا ذکر ہے جو حی و قیوم ہے اور جس کے لیے موت نہیں اس لیے حی و قیوم کے ذکر سے انسان کو حقیقی اور دائمی زندگی حاصل ہوتی ہے اور اس سے ذکر دائمی مراد ہے جس طرح انسان کی جسمانی زندگی کا مدار سانس کی آمد و شد پر ہے جونہی یہ سلسلہ منقطع ہوا موت آ گئی۔ اسی طرح ذکر الٰہی پر مداومت کرنا گویا حقیقی زندگی کو برقرار رکھنے کا عمل ہے۔

۳۔ عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان للہ تعالیٰ ملائکۃ یطوفون فی الطریق یلتمسون اہل الذکر فاذا وجدوا قوما یذکرون اللہ عزوجل تنادوا ھلموا الی حاجتکم فیحفونھم باجنحتھم الی السماء الدنیا قال فیسألھم ربھم ما یقول عبادی قال یقولون یسبحونک ویکبرونک ویحمدونک ویمجدونک فیقول ھل راونی فیقولون لا واللہ ماراوک فیقول کیف لو راونی قال یقولون لو راوک کانوا

اشد لك عبادة واشد لك تمجيدا واشد لك تحميدا
واكثر تسبيحا فيقول فما ذا يسئلون قال يقولون يسئلون
الجنة قال يقول هل راوها قال يقولون لا والله يا رب
ما راوها يقول كيف لو راوها قال يقولون لو انهم
راوها كانوا اشد عليها حرصا واشد بها طلباً
واعظم فيها رغبة قال فمم يتعوذون قالوا يتعوذون
من النار قال يقول وهل راوها قال فيقولون لا والله
ما راوها فيقول كيف لو راوها قال يقولون لو
راوها قال يقولون لو راوها كانوا اشد منها فراراً
واشد لها مخافة قال فيقول فاشهدكم انی غفرت
لهم قال يقول ملك من الملائكة فيهم فلان
ليس منهم انما جاء لحاجة قال هم الجلساء لا يشقى
بهم جليسهم (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا اللہ کے کچھ فرشتے ایسے ہیں کہ آبادیوں میں گھومتے ہیں۔ اہل ذکر کی تلاش میں پھرتے ہیں۔ اگر کسی کو کوئی ایسی جماعت مل جاتی ہے جو اللہ کا ذکر کر رہی ہو تو وہ فرشتہ دوسرے ساتھیوں کو آواز دیتا ہے کہ ادھر آؤ کہ ہمارا مطلوب و مقصود یہاں ہے پھر وہ فرشتے ان ذاکرین پر اپنے پروں سے آسمان دنیا تک سایہ کر لیتے ہیں۔ ان کا رب ان فرشتوں سے پوچھتا ہے حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ فرشتے جواب دیتے ہیں کہ تیری حمد و ثنا اور تسبیح و تقدیس کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے۔ جواب دیتے ہیں بخدا انہوں نے آپ کو نہیں دیکھا پھر سوال ہوتا ہے کہ اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو ان کی کیفیت کیا ہوتی جواب ملتا ہے الٰہی وہ تیری عبادت اور حمد و ثنا میں اپنی جان کھپا دیتے سوال ہوتا ہے وہ کیا مانگتے ہیں۔ جواب دیتے ہیں وہ جنت مانگتے ہیں۔ کیا انہوں نے جنت دیکھی ہے بخدا ہرگز نہیں۔ اگر انہوں نے جنت دیکھی ہوتی تو اُن کی حالت کیا ہوتی؟ اس کی طلب میں بہت زیادہ شدت پیدا ہو جاتی۔ رغبت بڑھتی۔

تو کیا وہ کسی چیز سے پناہ بھی مانگتے ہیں؟ ہاں! الٰہی وہ دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں کیا انہوں نے دوزخ کا نظارہ کیا ہے؟ بخدا ہرگز نہیں۔ اگر وہ دیکھ لیتے تو ان کی کیفیت کیا ہوتی؟

وہ اس سے سخت ڈرتے اور اس سے دُور بھاگنے کی کوشش کرتے اچھا تو میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے انہیں بخش دیا۔ ایک فرشتہ عرض کرتا ہے کہ فلاں آدمی اس جماعت ذاکرین میں سے نہیں یونہی کسی کام سے آیا ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ جواب ملتا ہے یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے ساتھ بیٹھنے والا بھی محروم اور بدبخت نہیں رہتا۔"

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور ثابت ہوتے ہیں۔

۱۔ فرشتوں کی ایک خاص جماعت صرف اس کام پر مامور ہے کہ ذاکرین کی تلاش کرتے رہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی جماعتیں اللہ کو پسند ہیں۔ اتنی پسند ہیں کہ ان کی تلاش بڑے اہتمام سے فرشتوں کی ایک مخصوص جماعت کے ذریعے کرائی جاتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں انعام

اکرام سے نوازے۔ جب یہ اللہ کی پسندیدہ جماعتیں ہیں تو ظاہر ہے کہ مجالس ذکر کا اہتمام کرنا حلقہ ذکر قائم کرنا اللہ کی رضا کا موجب ہوا اور اللہ کی رضا کا مقام خود اللہ تعالےٰ نے بیان فرمایا کہ ورضوان من اللہ اکبر تو اکبر کے حصول کے لیئے جو صورت ذریعہ بنے وہ بھی "اکبر" ہی ہوگی جبھی تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا ولذکر اللہ اکبر پھر بھی کوئی سادہ لوح مجالس ذکر اور حلقہ ذکر کا ثبوت مانگے یا اس سے چڑے ہو تو اس کی حالت قابل رحم ہے

۲۔ ذکر الٰہی میں کسی جماعت کی مشغولیت کے متعلق فرشتوں سے ذات باری کا بار بار استفسار یہ ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کو منظور ہے کہ فرشتوں کے سامنے بنی آدم کا شرف ظاہر کرے اور فرشتوں کو یہ جتانا بھی معلوم ہوتا ہے کہ دیکھو یہ وہی آدم ہے جس کی تخلیق کی بات سن کر تم حیرت زدہ ہو گئے جس سے معلوم ہوا کہ انسان کے لیئے موجب شرف یہ ہے کہ اس کا تعلق اور قلبی تعلق اپنے رب سے پختہ ہو اور ذکر الٰہی دراصل اللہ تعالےٰ سے بندے کے قلبی تعلق پیدا کرنے اور پختہ کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

۳۔ مومن کے لیئے مناسب یہی ہے کہ طاعت الٰہی تباع رسول کے لیئے اس بات کا انتظار نہ کرے کہ مجھے اس کا کوئی فائدہ نظر آئے یا حقیقت کا مشاہدہ ہو تو اللہ کی بات مانوں بلکہ اللہ تعالےٰ پر ایمان بالغیب اور نبی کریم پر کامل اعتقاد کا تقاضا یہی ہے کہ اطاعت برائے اطاعت ہو کیونکہ اللہ و رسول ﷺ اس کے مستحق ہیں اور بندہ ہونے کی وجہ سے اس کا یہ فرض ہے۔

۴۔ پورے خلوص کے ساتھ اگر انسان کے قلب کا رُخ اللہ کی طرف ہو جائے اور اس کا جھکاؤ اللہ کے سامنے ہو تو اس کی رحمت اُمڈ کے آتی ہے اور مغفرت اُسے ڈھانپ لیتی ہے۔

۵۔ مجالس ذکر میں محض بیٹھنا ہی اللہ کی رحمتوں کے حصول کا موجب ہے تو مجلسِ ذکر میں بیٹھ کر محبت اور خلوص سے ذکر الٰہی کرنے کی برکات کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ جنت کی طلب مذموم نہیں کیونکہ وہ دیدار الٰہی کا مقام ہے اور اس کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ (باقی آئندہ)

(۳) عن ابی ھریرۃ رضؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تعالےٰ یقول انا مع عبدی اذا ذکرنی وتحرکت بی شفتاہ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ حضور اکرم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ میرا ذکر کرتا ہے۔ اور میرے ذکر کے لیئے اس کے لیئے لب حرکت میں آتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہ حدیث قدسی ہے کہ بات بھی اللہ کی اور لفظ بھی اسی کے اس لیئے اس بات کی اہمیت فضیلت اور شرف ظاہر ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ذاکر کو اللہ تعالےٰ نے اپنی معیت کی بشارت دی ہے معیت باری کئی قسم کی ہوتی ہے ایک معیت علمی جو اللہ تعالیٰ کو تمام مخلوق سے ہے اس میں کسی نوع یا جنس کی تخصیص نہیں۔

دوسری معیت انسانوں میں سے خاص بندوں کے ساتھ
ہے جو انسانوں کے کسی ایسے عمل کی وجہ سے ہوتی ہے
جو اللہ کو بہت پسند ہوتا ہے جیسے

ان اللہ مع الصابرین - ان اللہ
مع المحسنین - ان اللہ مع المتقین

وغیرہ - اس لیئے ذکر الٰہی وہ عمل ہے جو اللہ کو بہت محبوب ہے - اس معیت سے اللہ کی طرف سے توفیق عمل اعانت رحمت اور رعایت ظاہر ہوتی ہے -

پھر معیت کے ساتھ عبادی فرمانا اور عباد کی اضافت اپنی طرف فرمانا اہل ذکر کے شرف کو ظاہر کرتا ہے انا مع عبدی کی نسبت انا مع عبدی میں ایک خصوصیت اور شرف کا بیان ہے بندے تو سب ہی مگر "اس کے بندے" وہی ہیں جن کے متعلق وہ خود کہے کہ "یہ میرے بندے ہیں" جن کے متعلق ابلیس کے چیلنج کے وقت اللہ تعالٰی نے فرمایا تھا کہ ان عبادی لیس لک علیہم سلطٰن یعنی "بندوں" کا شکار تو بے شک کرے گا مگر "میرے بندے" تیرے جال میں نہیں آئیں گے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ذکر الٰہی ایسا عمل ہے کہ اس کی وجہ سے بندے کو وہ شرف حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی نسبت اپنی ذات کے ساتھ کرتا ہے ، بندے کی قسمت اور سعادت کا کیا کہنا جسے خالق کائنات "میرا بندہ" کہہ کر یاد فرمائے

پھر ذکرنی سے ذکر قلبی اور تحرکت بی شفتاہ سے ذکر لسانی مراد ہو سکتا ہے ذکر کی اعلیٰ قسم وہی ہے جس میں ذکر قلبی اور لسانی کو جمع کیا جائے غائب قلب سے ذکر لسانی میں وہ بات کہاں جو حضور قلب سے ذکر کرنے میں ہے -

پھر ذکر کرنے اور ذکر میں مشغول رہنے کے درجہ کا اندازہ کرو کہ جونہی ذکر کے لیئے لبوں کو حرکت ہوئی رحمت باری امڈ کے آگئی اس سے ذکر الٰہی کے شرف میں مبالغہ کا اظہار ہوتا ہے

۵ - عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الشیطٰن جاثم علی قلب ابن آدم فاذا ذکر اللہ خنس واذا غفل وسوس -

(بخاری)

"حضرت ابن عباسؓ حضورؐ سے روایت کرتے ہیں کہ شیطان ، انسان کے قلب پر نظر جمائے گھات میں بیٹھا رہتا ہے جب انسان اللہ کا ذکر کرے وہ دور ہٹ جاتا ہے اور جب یاد الٰہی سے غافل ہو آگے بڑھ کر اس کے قلب میں طرح طرح کے وسوسے ڈالتا ہے"

انسان کے لیئے شیطان کے دشمن ہونے میں صرف اس شخص کو شک ہو سکتا ہے جو "ومن اصدق من اللہ قیلاً" پر یقین نہ رکھتا ہو - اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت انسان کو ایک بار نہیں کئی بار بتائی کہیں فرمایا کہ وہ تمہارا دشمن ہے کہیں فرمایا وہ تمہارا کھلا دشمن ہے کہیں اس کے ساتھ برتاؤ کرنے کے لیئے ہدایت فرمائی کہ ان الشیطان لکم عدو فاتخذوہ عدوا -

(باقی ص ۲۳ پر)

دینِ اسلام کی تدوینِ نَو کرنے والوں کا اصل روپ

الحاج شیخ محمد حبیب الرحمٰن ریٹائرڈ ایس۔ ای

اللہ جل شانہٗ نے آغازِ آفرینش ہی سے نوعِ انسانی کو عقیدۂ توحید کی تاکید فرمائی تھی اور انھیں "اُمتِ واحدہ" کا تصوّر دیا تھا۔ لیکن انسانوں کی بے نصیبی کہ وہ اس پر زیادہ دیر قائم نہ رہ سکے اور اپنی کجروی سے مختلف گروہ بنا لئے۔

"اور تمام انسان ایک ہی طریقے کے تھے (یعنی سب موحد تھے) پھر انہوں نے اختلاف پیدا کر لیا"

(سورۂ یونس۔ ۱۹)

اور پھر رفتہ رفتہ یہ خلیج وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ جب حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ آیا تو اس وقت بھی اللہ تعالےٰ نے تین قسم کے گروہوں کی موجودگی کی نشاندہی فرمائی یعنی کفار و مشرکین۔ منافقین اور اہلِ ایمان۔ لہٰذا لوگوں کے درمیان غلط فہمیاں اور اختلافات دُور کرنے کے لئے احکم الحاکمین نے اپنی آخری کتاب ہدایت (یعنی قرآن کریم) نازل فرمائی تاکہ لوگ عقیدۂ توحید اعمالِ صالحہ، اخوت، مساوات اور وحدت انسانیت کی راہ پر دوبارہ گامزن ہو جائیں۔ چنانچہ دینِ حق کی وضاحت سے اہلِ باطل کا سارا تانا بانا بکھر گیا۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ۝ (بنی اسرائیل۔ ۸۱)

"اور اے نبی آپ کہہ دیجئے کہ حق آیا اور باطل رخصت ہوا (اور) واقعی باطل ہے ہی مٹ جانے والی چیز"

اور حق کی سربلندی کے بعد صرف دو جماعتیں باقی رہ گئیں۔ یعنی حزبُ اللہ اور حزبُ الشیطٰن ـــ لیکن آج پھر لوگوں نے حق کو پسِ پشت ڈال دیا ہے اور خالق کے اعلیٰ ترین فہم و شعور کے مقابلہ میں اپنی ناقص و محدود عقل و دانش کو ترجیح دی ہے اور اب وہی سابقہ تینوں جماعتیں نئے روپ اور نئے نعروں کے ساتھ دوبارہ اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ چونکہ یہ نام ان کی طبع نازک پر گراں گذرتے ہیں اس لئے انہوں نے

تے اپنے نام بھی نئے رکھ لئے ہیں، تاکہ اصل روپ ظاہر نہ ہو۔ ان کے نئے نام یہ ہیں۔ اول عوام پسند۔ دوم ترقی پسند۔ آیئے دیکھیں ان نئے رخ زیبا کے جلوے کیسے ہیں:

پہلا گروپ اپنے آپ کو عوام دوست بھی کہتا ہے وہ اس سرچشمۂ حیات ہی کا انکار کرتے ہیں جہاں سے اس کائنات میں زندگی اور جمال و کمال کے حیات بخش فوارے پھوٹ رہے ہیں وہ ہر اس بات کے منکر ہیں جس کی بنیاد دین و مذہب پر ہو۔ وہ "امر بالمعروف" کے منکر اور ان تمام باتوں کے حامی ہیں جن کو قرآن کریم نے "منکرات" سے تعبیر کیا ہے۔ در اصل ان کے عزائم نیک نہیں ہیں وہ عوام دوستی کے روپ میں غریب، محنت کش، بے بس کسانوں اور خدا کے سادہ لوح بندوں پر فرعون و نمرود بن کر مسلط ہونا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ خود لینن نے کہا تھا۔

"سوشلسٹوں کا اخلاق و شریعت تو صرف اس قدر ہے کہ ڈکٹیٹر شپ کی قوت و سطوت کا استحکام کس صورت سے برقرار رہ سکتا ہے جماعتی مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب، دروغ بافی، فریب دہی، عین حق و صداقت ہے"

کارل مارکس کا قول ہے کہ

"مذہب عوام کی افیون ہے اور عوام کا ناجائز استحصال کرنے کے لئے آلۂ کار ہے"

کارل مارکس کے رفیق انجلز کا کہنا ہے کہ "ہماری جماعت مذہبی اعتقادات کی پیدا کردہ جہالت سے غفلت نہیں برت سکتی" لینن نے کہا کہ

"اشتراکیت الحاد کے بغیر اور الحاد اشتراکیت کے بغیر ناممکن ہے لیکن ان کا طریقہ کار یہ ہے کہ جیسا کہ لینن نے خود اعتراف کیا کہ "ہم کبھی واضح طور پر الحاد کا اعلان نہیں کرتے۔"

ایک طرف ان کا انداز فکر یہ ہے کہ لوگوں کو حیوانی سطح پر رکھا جائے تاکہ انہیں جانوروں کے ریوڑ کی طرح اپنے مفاد کی خاطر جدھر چاہیں ہانک سکیں اس لئے حیوانی خصلتیں بیدار کرنے کے لئے یہ گھناؤنا فلسفہ ایجاد کیا کہ

"بادہ نوشی اور حرام کاری میں کوئی ایسی معیوب بات نہیں جس سے انسان خواہ مخواہ شرماتا پھرے۔ تند و تیز مے نوشی اور جذبات فحش کاری فطری جذبات ہیں اور جو چیز فطری ہو وہ ناجائز کیسے ہو سکتی ہے"

اشتراکیوں کا نظریہ یہ ہے کہ انسانوں کو اس دنیا میں اپنے جذبات و خواہشات نفسانی کی تسکین کے لئے تمام مواقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے جن کے لئے مذہب جیسی پابندیوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ مردوں کو تمام عورتوں کے لئے اور عورتوں کو تمام مردوں کے لئے مشترک جنس اور عیاشی کا حسین کھلونا سمجھتے ہیں۔

چنانچہ جب بخارا میں اسلام کی بیخ کنی کی جا رہی تھی تو یہ نعرہ سر عام لگایا گیا کہ

"ہم نے تمہارے مویشی تم سے چھین لئے ہیں۔ اب ہم تمہاری بہو بیٹیوں کو مشترکہ

ملکیت بنائیں گے سامان کو اپنے پاس سکلائیں گے"

اسی طرح ہمارے ایک عوامی وزیر اعظم نے کوئٹہ کے ایک جلسہ عام میں بلوچوں کی غیور مسلمان خواتین کو اپنے چہروں سے نقابیں اُلٹ کر اپنے جلووں کا دیدار عام کرانے کا حکم دیا تھا۔

دوسری طرف وہ عوام الناس کو روٹی، کپڑے اور مکان کے بکھیڑوں ہی میں اُلجھائے رکھنا چاہتے تھے تاکہ اُن کے پاس نہ اتنا فالتو وقت ہو اور نہ صلاحیت کہ وہ اقتدار پر قابض گروہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکیں یا اُن کے ظلم و استبداد کے خلاف کوئی آواز نہ بلند کر سکیں۔

آج پولینڈ جیسے اشتراکی ملک میں مزدوروں کی تنظیم "سالیڈیرٹی" کا جو حشر کیا گیا وہ دنیا کے سامنے ہے۔ امریکہ کی سرکاری رپورٹ کے مطابق سال ۱۹۸۱ء کے دوران روس میں دس ہزار افراد جیلوں میں بند کئے گئے جبکہ چالیس لاکھ سے زائد لوگوں سے مشقت کیمپوں میں بیگار لی جا رہی ہے۔ دس ہزار باشندے جلاوطنی کی زندگی گذار رہے ہیں اور پانچ ہزار نفسیاتی ہسپتالوں میں داخل ہیں۔ عوام دوست حکومت میں حقوق انسانی کی پامالی کا یہ منظر ہے۔ لہذا اشتراکیت کو محض ایک اقتصادی نظام قرار دینے والے خود فریبی میں مبتلا ہیں۔

ان جیسے جابر حکمرانوں، فواحش کے پرستاروں اور بُتوں کے پجاریوں سے آپ اسلام کے نفاذ اور توحید کی تبلیغ کی توقع کیونکر رکھ سکتے ہیں؟

دوسرا گروہ دانشوروں کی وہ جماعت ہے جو مغرب کی مادی ترقی، دولت کی ریل پیل اور نت نئے بدلتے ہوئے عیش و نشاط سے لبریز اور آزادانہ طرز حیات کی سحر کاری سے بے حد متاثر ہیں۔ ان کے خیال میں سماجی تحفظ، تہذیب و ثقافت اور فلاحی ریاست کا مغربی تصور اتنا قابل رشک ہے کہ اگر شریعت اسلامی مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی توقعات پر پورا نہ اتر سکی یا ان کی تازہ ترین امنگوں کو نظر انداز کیا گیا، یا اس کوشش میں اسلام کو آڑا اور ڈھال بنایا گیا تو ایک "زلزلہ" آجائے گا اور تمام معاشرتی قدریں اور دین و مذہب سب بے چینی کے سیلاب میں بہہ جائیں گے۔ لہذا ان کا اصرار یہی ہے کہ افکار مغرب نے نوجوانوں کے لیئے جو بے شمار نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کے پیش نظر پرانے فقہ اسلامی کے فیصلوں کو ترک کر کے جدید ماحول کے مطابق جرأت اور تیزی سے نئے فیصلے کئے جائیں تاکہ جدید الخیال طبقہ "مطمئن" ہو سکے۔ بالفاظِ دیگر وہ اپنی جدید مصلحتوں کو پورا کرنے کی خاطر علمائے دین سے قرآن و حدیث کی اپنی خود ساختہ "تعبیرِ جدید" پر اجتہاد کی چھاپ لگوانا چاہتے ہیں تاکہ اسلام کو "از سرِ نو دریافت" کر کے اسلام کی سچی تعلیمات کا رُخِ دلکش دنیا کو دکھایا جا سکے۔ یہی وہ جدید الخیال لوگ ہیں جن کے متعلق کسی نے سچ کہا تھا کہ ؎

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ اس تدوین نو سے اُمت میں کیا کچھ انتشار پیدا ہوگا یا دین حق کے عقائد کی جڑیں کتنی ڈھیلی ہو جائیں گی پہلے زمانہ میں بھی ایسے ہی "دانشور" پیدا ہوئے تھے۔ لیکن ان کی

وقت بھی ان کی یہ شرارت کامیاب نہ ہو سکی تھی اور آج بھی انہیں رب کائنات کا یہ جواب سُن کر اپنی عقل و دانش کا محاسبہ کرنا چاہیے۔

" بلکہ (ان کے تکذیب کی اصل وجہ یہ ہے کہ) یہ رسول
ان کے پاس حق بات لے کر آئے اور ان میں
اکثر لوگ حق بات سے نفرت رکھتے ہیں۔
اور اگر دین حق ان کے خیالات کے تابع ہو
جاتا تو تمام آسمانوں اور زمین اور جو ان میں
(آباد) ہیں سب تباہ ہو جاتے۔" (المؤمنون ۷۱)

یہ لوگ نہیں چاہتے کہ ان کے فکر و عمل پر اسلامی شریعت کے سنگین پہرے بٹھائے جائیں۔ دین حق صرف چند عقائد کا مجموعہ نہیں ہے۔ یہ تو عقائد کے ساتھ ایک قانون بھی ہے جو انسانی زندگی کی حدود اور طریقہ متعین کرتا ہے اس پر نیکی و بدی، حرام و حلال، حقوق و واجبات اور اخلاق و عبادات کی چند بندشیں عائد کرتا ہے جس کی وجہ سے انسانی زندگی میں ایک انقلاب آجاتا ہے اور ان کا طرزِ حیات ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتا ہے مگر سرکش انسانوں پر یہ حدود اور بندشیں بہت ناگوار گذرتی ہیں، لہذا وہ اللہ تعالے اور اس کے دین حق سے بچ کر نکلنے کے لئے بہانے تراشتے رہتے ہیں۔ کتاب اللہ پر تو ان کا کچھ بس نہیں چلتا۔ مگر سنت نبوی جو احکام الٰہی کی مستند تشریح ہے اور عملی طریقہ حیات کی صحیح صورت متعین کرتی ہے اس میں طرح طرح کے شکوک و شبہات ڈال کر احادیث نبوی کا احترام و یقین بھی مسلمانوں کے دلوں سے مٹا دینے کے درپے ہیں۔ تاکہ تعلیمات نبوی کو مسخ کر کے احکام الٰہی کو ان کی مرضی اور پسند کے معنی پہنائے جا سکیں۔ اور اس طرح انہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے "اسوہ حسنہ" کے مطابق زندگی گذارنے کی پابندی (جس کا حکم خود باری تعالے نے سارے انسانوں کو دیا) سے چھٹکارا مل جائے۔

دراصل انہوں نے دنیوی زندگی کو آخرت کی زندگی پر مقدم رکھا ہے، ہوس نفس اور حرص مال نے ان کی فطرت ہی ایسی مسخ کر دی ہے کہ عقل و دانش کے باوجود بے راہ ہو گئے ہیں۔

" اور کیا آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی
جس نے اپنا خدا اپنی خواہشات نفسانی
کو بنا رکھا ہے اور اللہ تعالے نے اس
کو باوجود سمجھ بوجھ کے گمراہ کر دیا ہے۔"
(الجاثیة ۲۳)

اور آخرت سے غفلت کا سبب بھی اُن کے ناپسندیدہ اعمال ہیں۔

" اور (روز جزا کو) تو وہی جھٹلاتا ہے جو حد
(عبودیت) سے گذرنے والا ہو، مجرم ہو اور
جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی
تو یوں کہہ دیتا ہے کہ اگلوں سے منقول چلی آتی
ہیں۔ ہرگز ایسا نہیں بلکہ (اصل وجہ یہ ہے کہ)
ان کے دلوں پر ان کے (اعمال (بد) کا
زنگ بیٹھ گیا ہے۔"
(التطفیف ۱۲ تا ۱۴)

ان کی کوشش یہ ہے کہ دین اسلام کی ایسی تدوین نو کی جائے کہ اس میں باطل کو قبول کرنے کی لچک پیدا ہو جائے حتی کہ

پھر باطل، باطل نہ رہے، بلکہ باطل بھی سارا حق ہی ہو جائے
یہ نہایت خطرناک کھیل ہے جو وہ کھیل رہے ہیں اس
طرزِ عمل سے انہوں نے اپنے آپ کو دانستہ یا نادانستہ
طور پر ان لوگوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے جن کا قرآن کریم
نے یوں ذکر فرمایا ہے۔

"اور ان لوگوں میں سے بعض ایسے بھی
ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر
اور آخرت کے دن پر حالانکہ وہ بالکل ایمان
والے نہیں۔ چالبازی کرتے ہیں اللہ سے
اور ان لوگوں سے جو ایمان لا چکے ہیں اور
واقعہ یہ ہے کہ وہ کسی کے ساتھ چالبازی
نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے۔ اور وہ
اس کا شعور نہیں رکھتے۔ ان کے دلوں میں
بڑا مرض ہے۔ سو اور بھی بڑھا دیا اللہ نے
ان کا مرض۔ اور ان کے لئے سزا ہے
اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے
اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت
کرو اللہ کی زمین میں، تو کہتے ہیں کہ ہم تو
اصلاح ہی کرنے والے ہیں۔ یاد رکھو
بلاشبہ یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ اس کا
شعور نہیں رکھتے۔" (البقرۃ ۸ تا ۱۲)

ان جدید الخیال مفکرین کی روشن ضمیری اب
ہمارے معاشرہ کے ہر گوشہ کو روشن کر رہی ہے
ہماری فلموں میں اگر ایک طرف ہیرو کسی لیلےٰ کے پیچھے
وفورِ تمنا سے اچھلتا کودتا اور بنسری بجاتا نظر آتا ہے تو

دوسری طرف خواتین سرِ عام ڈھولک کی تھاپ پر رقص کر
کے ماحول کو رنگین و سازگار بناتی دکھائی دیتی ہیں۔ کھیلوں
کے میدانوں میں اب نوجوان لڑکیاں ہاکی اور کرکٹ سے
مرد شائقین کے لئے اچھلتے چھلکتے جامِ شیریں بستاد
کھلی فضاؤں میں لہرا کر خوب داد و تحسین حاصل کر رہی ہیں۔

اخبارات و رسائل "فنکاری" میں ایک دوسرے
سے بازی لے جانے میں مصروف ہیں، آرٹ کونسلوں میں
"ستار کی "سُروں" کو خدا اور نغموں کو عبادت سمجھنے والے
اب ہمہ وقت سربسجود رہتے ہیں۔

اسی طرح جب شادی کے مسائل زیرِ غور آئیں گے
تو پتہ چلے گا کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے اور معاشرے
کو انتشار سے بچانے کے لئے اب مذہب کو شادی کے
معاملے میں رکاوٹ نہیں بننے دیا جائے گا۔ ایک مسلم
خاتون کا خاوند ہندو بھی ہو سکتا ہے جبکہ مسلم نوجوان
کسی ہندو، عیسائی یا یہودی لڑکی سے شادی کرنے میں
بالکل آزاد ہے البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ خاوند اگر رمضان
میں روزہ رکھے گا تو وہ بیوی کی خاطر کسی شراب کی دکان
پر بھی کھڑا نظر آئے گا۔ اور جب عیسوی سال نو آئے
گا تو کراچی کے کسی ہوٹل میں بہترین لباس زیب تن کر کے
رقص و سرود کی محفلیں جما کر سالِ نو کا استقبال کیا کریگا

الغرض یہ تمام عیش و طرب کے جلوے پبلک
کے لئے بصد اصرار یہ ترتیب دیئے جا رہے ہیں تاکہ جدید الخیال
نوجوانوں کو مطمئن کیا جا سکے۔ ورنہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو نوجوانوں
کے لئے بے شمار معاشرتی مسائل کھڑے ہو جائیں
گے اور معاشرے میں زلزلہ آ جائے گا۔ یہ ہے وہ فلاحی

ریاست کا مغربی تصور جس میں ہر طرف فلاح و کامرانی کے ڈنکے بجیں گے بلکہ بقول ایک اردو روزنامہ کے اب تو ٹی وی اور فلموں سے بے غیرتی کی باتصویر تربیت گاہیں وجود میں آگئی ہیں اور بعض کلب اور جم خانے عیاشی کے مراکز بنے ہوئے ہیں جہاں "ابلتی آنکھوں، تھرکتی رانوں، بہکتی چالوں اور شرافت کے ان جنازوں کو کندھا دیتی گفتگوؤں کے مناظر کو دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب انسانی عقل اس حد تک مفلوج ہو چکی ہو تو آپ محض سرکاری قانون اور ضابطے نافذ کر کے یا ہر جمعہ کو ریڈیو پاکستان سے "عہد میثاق" نشر کر کے، یا سیرت کانفرنسوں میں تقریریں کر کے معاشرے پر چھائے ہوئے بااثر اور ایسے جدید الخیال مفکرین و دانشوروں کے اطوار اور رچی بسی عادات کو کس طرح تبدیل کر سکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ حال ہی میں اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شوریٰ کونسل کے ممبران کو خطاب کرتے ہوئے دو موقعوں پر صدر پاکستان کو یہ علی الاعلان اعتراف کرنا پڑا کہ کونسل کی سفارشات پر معاشرہ کو اسلامی بنانے کے لیے جو اقدام کیے گئے اُن کے خاطر خواہ نتائج نہیں نکلے۔

اسلام پسند گروہ کے لوگ اگرچہ نیک نیت اور مخلص ہیں، لیکن یہ ان کی بے عملی اور بے توجہی کا ہی نتیجہ ہے کہ مخالف جماعتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ سابقہ اُمتوں کے واقعات پڑھ جائیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے زوال کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ بے حیائیوں کو فروغ دینے اور بد اعمالیوں کو روکنے کے فرض سے غافل ہو گئے تھے وہ برائیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے سرزد ہوتے دیکھتے لیکن ان میں کراہت اور نفرت کا کوئی جذبہ بیدار نہ ہوتا۔ کوئی احتجاج تک نہ کرتا۔

ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے

"اس کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تمہیں لازم ہے کہ نیکی کا حکم کرو اور برائی سے روکو اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو اور اُسے حق کی طرف موڑ دو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں پر بھی ایک دوسرے کا اثر ڈال دے گا یا تم پر بھی اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح تم سے پہلوں پر کی تھی"

یہ رب العلمین کی قدیم سنت چلی آتی ہے کہ اپنے بندوں میں سے وقتاً فوقتاً ایسی جماعتوں کو چن لیتا ہے جو اس کی ارض پاک پر پاکیزگی و طہارت قائم رکھنے کے ذمہ دار ہوں لیکن جب اس جماعت کا اپنا وجود ہی کثافت و گندگی سے غبار آلود ہو جاتا ہے تو غیرت الٰہی اس بار آلودگی سے اپنی زمین کو ہلکا کر دیتی ہے۔ بنی اسرائیل کی مثال ہمارے سامنے ہے ہم سے پہلے خلافت ارضی کے وہی وارث تھے۔ لیکن پھر کیا انجام ہوا۔

"بنی اسرائیل کو ان کی نافرمانیوں کی سزا میں

(باقی ص ۳ پر)

(ادارہ)

سادہ زندگی

خودنمائی انسان کی وہ کمزوری ہے جسکی وجہ سے اس کی زندگی میں تکلف تصنع اور بناوٹ کا اہتمام کرنے کا جنون در آتا ہے۔ اسلام نے اس جھنجھٹ سے بچنے کے لیئے سادہ بے تکلف اور سکون و راحت کی زندگی بسر کرنے پر زور دیا ہے۔ مگر بایں ہمہ نبی کریمؐ نے خوش پوشاکی صفائی اور پاکیزگی کی ہدایت فرمائی ہے۔ اسکی کئی وجہیں نظر آتی ہیں:۔

۱۔ جو لوگ صاحب مقدرت ہوں ان کو بخل جیسے مذموم خلق سے کنارہ کش ہو کر ایسا لباس اور ایسی وضع اختیار کرنی چاہیئے جس سے ان کی معاشی سطح کا اظہار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دولت مند شخص سے فرمایا کہ "جب اللہ نے تمہیں مال دیا ہے تو اس کے لطف و کرم کا اثر تمہارے جسم سے ظاہر ہونا چاہیئے۔"

۲۔ بدویانہ اور وحشیانہ زندگی سے نکل کر ہر شخص کو تمدنی زندگی اختیار کرنی چاہیئے اور لباس کا یہ اثر اس کی جسمانی حالت سے بھی نمایاں ہونا چاہیئے۔ اس بنا پر جب حضورؐ نے ایک شخص کے بال بکھرے ہوئے دیکھے تو فرمایا "کیا اسے بال سنوارنے کا سامان نہیں ملتا" اور ایک شخص کے کپڑے میلے دیکھے تو فرمایا "کیا اس کو کپڑے دھونے کے لئے پانی میسر نہیں آتا" لیکن اس کے ساتھ چند وجوہ سے انتہائی تکلف انتہائی نمائش اور انتہائی زیب و زینت کی ممانعت بھی فرمائی مثلاً:

۱۔ ایک وجہ تو یہ کہ دولتمند لوگوں کے جسمانی تکلفات کو دیکھ کر محتاجوں کی دل شکنی اور توہین نہ ہو اور ان کے دلوں میں رشک و حسد کا جذبہ نہ پیدا ہونے پائے۔ آج کی دنیا میں سرمایہ داری کے خلاف جو شورش پھیل چکی ہے اس کا اصل سبب یہی ہے کہ دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔

ایک تو امیروں کی آبادی ہے جو انتہائی عیش و عشرت کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہے دوسرے غریب لوگ ہیں جو نان شبینہ کے بھی محتاج ہیں اور یہ لوگ جب امیروں کے مسرفانہ تکلفات کو دیکھتے ہیں تو ان کے

مقابل میں اپنی توہین محسوس کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں رشک و حسد کا جذبہ پیدا ہو کر شورش و بغاوت کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور وہ لوگ دنیا میں توازن اور مساوات قائم کرنے کے لیئے مساویانہ حیثیت سے تقسیم دولت کا مطالبہ پیش کرتے ہیں لیکن جس طرح آج یورپ میں اور امریکہ میں اُمراء اور غرباء کے درمیان یہ فرق مراتب پیدا ہو گیا ہے اسی طرح نبی کریمؐ کے عہد مبارک میں بھی اُمراء و غرباء کے درمیان یہ دیوار حائل ہو گئی تھی اس لیئے ایسی حالت میں ایک ایسے معتدل نظام اخلاق کی ضرورت تھی جو ایک طرف تو اُمراء کی بیجا اور مسرفانہ نمائشوں کو کم کر دے دوسری طرف فقر و فاقہ کو غرباء کے لئے ننگ و عار قرار دے۔ تو صحابہ کرام کے درمیان بھی یہ فرق مراتب قائم تھا۔ بالخصوص اصحاب صُفّہ کا گروہ ایک ایسا گروہ تھا جسکی حیثیت کا قائم رکھنا جس قدر ضروری تھا اسی قدر مشکل بھی تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی ذات سے اسلام کی بڑی بڑی خدمتیں انجام پاتی تھیں، تعلیم و تعلم کا صیغہ انہی کی ذات سے قائم تھا اور یہی لوگ تھے جو ہمیشہ قرآن مجید کے درس و تلاوت میں مصروف رہتے تھے۔ اور مدینہ سے باہر جب کبھی اشاعت اسلام کی ضرورت ہوتی تھی یا باہر کے صحابہؓ رسول کریمؐ کی خدمت میں آکر درس قرآن یا فرائض اسلام کی تعلیم یا اشاعت اسلام کے لیئے معلم اور مبلغ کی درخواست کرتے تھے تو ان مقدس خدمات کے لیئے انہی لوگوں میں سے اشخاص منتخب کیئے جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ اصحاب صفہ کے علاوہ ان کا ایک لقب "قراء" بھی تھا یعنی پڑھنے پڑھانے والے لوگ۔ یہ جماعت اگرچہ فقر و فاقہ کی انتہائی حد تک پہنچ چکی تھی تاہم ان کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے۔ چنانچہ خود قرآن مجید نے ان کی شان استغناء کو سراہا ہے ارشاد ہے:

(خیرات تو) ان حاجتمندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھرے بیٹھے ہیں۔ ملک میں کسی طرف کو جانا چاہیں، جا نہیں سکتے (جو شخص ان کے حال سے بے خبر ہے وہ) ان کی خودداری کی وجہ سے ان کو دولت مند سمجھتا ہے (لیکن اے مخاطب) تو ان کو دیکھے تو ان کی صورت سے ان کو (صاف) پہچان جائے (کہ محتاج ہیں مگر یہ) لگ لپٹ کر لوگوں سے نہیں مانگتے ہیں۔ (۲: ۲۷۳)

لیکن اس استغنا، اس خودداری، اور اس زہد و تقدس کے باوجود جہاں تک ظاہری حالات کا تعلق ہے یہ لوگ مسلمانوں کی سوسائٹی میں کم حیثیت سمجھے جا سکتے ہیں اس لئے یہ ضرور تھا کہ ان کی تسلی اور ان کے درجہ کو بلند کرنے کے لئے فقر و فاقہ کو دولتمندی پر ترجیح دی جائے۔ یا کم از کم فقر و فاقہ کو ذلت و حقارت کا سبب نہ قرار دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریمؐ نے بعض موقعوں پر ان بزرگوں کو دولت مندوں پر ترجیح دی ہے چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ۔

"ایک دفعہ نبی کریمؐ کے پاس سے ایک شخص گزرا۔ ایک بزرگ پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ حضورؐ نے ان سے پوچھا کہ ان کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے؟ بولے یہ بہت شریف آدمی ہیں اگر وہ کسی کے یہاں نکاح کا پیغام دیں تو خدا کی قسم نکاح کرنے کے قابل ہیں اگر کسی کی سفارش کریں تو اس کے مستحق ہیں کہ ان کی سفارش قبول کی جائے۔ اس کے بعد اصحاب صفہ میں سے ایک بزرگ وہاں سے گزرے تو حضورؐ

نے ان کی نسبت بھی اس بزرگ سے رائے طلب کی بولے یہ تو فقرائے مسلمین میں سے ہیں۔ اگر نکاح کا پیغام دیں تو نکاح کرنے کے قابل نہیں اگر کسی کی سفارش کریں تو وہ سفارش نہ قبول کی جائے اور اگر بات کریں تو کوئی ان کی بات نہ سنے حضورؐ نے یہ سنکر فرمایا کہ سطح زمین پر جو کچھ ہے یہ بزرگ ان سب سے بہتر ہیں۔"

اصحاب صفہ کے علاوہ صحابہ کرامؓ میں ایک گروہ مہاجرین کا بھی تھا جو محض اپنے دین کی حفاظت، نبی کریمؐ کے فیض، صحبت اور دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے گھر بار اپنے مال و دولت پر لات مار کر مدینہ میں آ بسے تھے۔ ان کا گذر اوقات بھی ایک مدت تک زیادہ تر انصار پر تھا جو کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے اس لئے یہ لوگ فقرائے مہاجرین کے نام سے موسوم تھے۔ یہ لوگ اگرچہ گھر بار کی طرح مال و جائیداد کی محبت بھی اپنے وطن ہی میں چھوڑ آئے تھے تاہم بعض وجہ سے ان کے دلوں میں بھی دولتمندوں پر رشک کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔

آج سوشلسٹ گروہ دولتمندوں پر اس لئے رشک کرتا ہے کہ ان کے پاس عمدہ فرنیچر ہے، موٹر ہے عمدہ باغ ہے عمدہ عمارت ہے، فیکٹری ہے عمدہ سوٹ ہے وغیرہ۔ کیونکہ اس وقت زمانہ کا میلان یہی ہے۔ اس میلان کے مطابق ان لوگوں کے دلوں میں رشک ہی نہیں حسد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن عہد نبوت میں صحابہ کا میلان یہ تھا کہ محتاجوں کی امداد کی جائے۔ کار خیر میں روپیہ خرچ کیا جائے غریبوں پر احسان کیا جائے۔ اور ان سب کے بدلے ثواب آخرت حاصل کیا جائے چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب نبی کریمؐ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو مہاجرین نے آپکی خدمت میں آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم جس قوم کے ہاں بطور مہمان اترے ہیں ہم نے ان سے زیادہ فیاض، ان سے زیادہ مددگار کسی قوم کو نہیں پایا یہ لوگ ہم سے کسی قسم کی محنت تو لیتے نہیں البتہ کھیتی باڑی کی پیداوار میں ہمیں اپنا شریک بنا لیتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ تمام ثواب یہی حاصل کر لیں۔ ارشاد ہوا جب تک تم لوگ انہیں دعا دیتے رہو گے ان کی تعریف کرتے رہو گے ایسا نہیں ہوگا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ فقرائے مہاجرین نبی کریمؐ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہؐ آخرت کے تمام درجے اور تمام نعمتوں کو دولتمند لوگ لے اڑے، کیونکہ جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں وہ بھی اسی طرح پڑھتے ہیں ہم جس طرح جہاد کرتے ہیں وہ بھی اسی طرح کرتے ہیں لیکن ان کو مزید فضیلت یہ ہے کہ وہ فاضل مال کو اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں اور ہمارے پاس اس مقصد کے لئے مال نہیں یہ سنکر حضورؐ نے ان کو ایک دعا بتا دی جس سے بڑے ثواب کی توقع تھی۔

ان اسباب سے آپ نے ان غریبوں کی تسکین و تشفی کے لئے اپنی اخلاقی تعلیمات کے ذریعے فقر و فاقہ کا درجہ بلند کیا ان اخلاقی تعلیمات کی موزونیت کے لئے اسلام کے مختلف زمانوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ابتدائے اسلام میں صحابہ بالخصوص اصحاب صفہ اور مہاجرین بالکل تہی دست تھے اور ان کی معاش کا دارو مدار صرف دولتمند اور فیاض صحابہ کی اعانت اور امداد پر تھا۔ اس لئے اس زمانے میں دولتمندوں کے لئے زائد از ضرورت مال جمع کرنا منع تھا۔ اور یہ حکم تھا کہ اپنی ضرورت سے زائد جو مال ہو اس کو محتاج صحابہ کی امداد اور اسلام کی

تقویت میں صرف کرنا چاہیئے۔ یہ تھا قُلِ الْعَفْوَ کا مفہوم یہ آیت بعض محدثین کے نزدیک اسلام کے اسی ابتدائی زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی ابتدائے اسلام میں جب زکواۃ فرض نہیں ہوئی تھی تو صحابہ کو حکم تھا کہ ان کی ضرورت سے جو مال بچ جائے اس کو جمع نہ کریں بلکہ اللہ کی راہ میں صرف کریں۔ حضرت ابوذر غفاریؓ ایک قدیم الاسلام صحابی تھے اور ان کو اس زمانہ کی مناسبت سے نبی کریمؐ نے اس قسم کی بہت سی اخلاقی تعلیمات دی تھیں۔ مثلاً غربا کے ساتھ محبت رکھو ان کی صحبت اختیار کرو۔ اس شخص کو دیکھو جو تم سے کم رتبہ ہو اس کو نہ دیکھو جو تم سے بلند رتبہ ہو۔ عزیز و اقارب اور پڑوسیوں کے ساتھ ایثار کرو۔ سونا چاندی جمع نہ کرو۔ یہ اخلاقی تعلیم اس زمانے کی حالت کے بالکل مطابق تھی نہایت موثر اوقات اور موثر انداز میں دی گئی تھی۔ حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں۔

میں ایک دفعہ نبی کریم کے ساتھ مدینہ میں جا رہا تھا کہ مدینہ کا پہاڑ اُحد سامنے آیا تو اس کو دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ اگر میرے پاس اس پہاڑ کے برابر سونا ہو تو مجھے یہ پسند نہیں کہ اس پہ تین گذر جائیں اور اس میں سے میرے پاس ایک اشرفی بھی رہ جائے بجزُ اس رقم کے جسے میں قرض ادا کرنے کے لیئے محفوظ رکھوں بلکہ میں اس کو دائیں بائیں بکھیر دونگا یعنی فیاضی کے ساتھ سب کو صرف کر دوں گا۔

انہی حالات اور انہی اخلاقی تعلیمات کو مدنظر رکھ کر حضرت ابوذر غفاریؓ کا مسلک یہ تھا کہ انسان کے لیئے مال و دولت کا جمع کرنا جائز نہیں بلکہ اپنی ضرورت میں صرف کرنے کے بعد بیش انداز رقم کو غربا میں تقسیم کر دینا چاہیئے۔ اگرچہ اور صحابہ اس سے اختلاف رکھتے تھے تاہم یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ ابتدائے اسلام میں اسلام کا اخلاقی اصول یہی تھا لیکن بعد میں جب زکواۃ فرض ہوئی اور فقراء و غربا کی اعانت کا سامان ہو گیا تو وہ حکم منسوخ ہو گیا لیکن حضرت ابوذر اس نسخ کے قائل نہیں ہوئے اور عمر بھر اس کی تبلیغ کرتے رہے۔

ان احادیث سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اسلام نفس مال و دولت کا مخالف ہے بلکہ وہ اس کو صرف اس صورت میں ناجائز قرار دیتا ہے جب اس کو نیک کاموں میں صرف نہ کیا جائے چنانچہ حدیث میں بھی اس کی تصریح ہے اور محدثین نے بھی اس حدیث کی شرح میں اسکی تصریح کر دی ہے

اسلام کی یہ اخلاقی تعلیمات اس زمانے سے تعلق رکھتی ہے جب مسلمان نہایت غربت کی حالت میں تھے لیکن جب اسلام نے قوت حاصل کرنا شروع کی اور فتوحات کی وجہ سے اسلام کے دامن میں مال و دولت کا ذخیرہ ہونا شروع ہوا اس وقت بھی نبی کریم نے مال و دولت کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی۔ بلکہ اس وقت بھی مختلف اخلاقی سیاسی اور تمدنی حالات کے لحاظ سے اسی قسم کی زاہدانہ تعلیم دیتے رہے اور میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس وقت اس قسم کی تعلیم کے مختلف اسباب تھے۔

ا۔ پہلا سبب یہ تھا کہ جب مال و دولت کی کثرت ہوتی ہے تو قوموں میں باہم رشک و حسد کا مادہ پیدا ہوتا ہے جو ترقی کر کے بغض و عداوت کا سبب بن جاتا ہے جس کا آخری نتیجہ جنگ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یورپ کی سب سے بڑی جنگ انہی اقتصادی اسباب سے ہوئی اسلام میں بھی فتوحات اور فتوحات کے ساتھ مال و دولت میں اضافہ ہوا

تو حضور اکرمؐ کو خود صحابہ کی نسبت اس کا خطرہ پیدا ہوا۔ چنانچہ ایک بار فرمایا مجھے زمین کے خزانے کی کنجیاں مل گئی ہیں۔ لیکن مجھے یہ خوف نہیں کہ تم لوگ میرے بعد شرک کرو گے البتہ یہ خوف ہے کہ تم میں مال و دولت کے متعلق رشک و حسد پیدا ہوگا۔ ایک بار حضرت ابو عبیدہؓ بحرین کا جزیہ وصول کر کے لائے اور انصار کو اس کی خبر ہوئی تو نماز فجر کے بعد انہوں نے آپ سے اس کی تقسیم کی درخواست کی آپ ان کو دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا کہ تمہیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ابو عبیدہؓ کچھ مال لے کر آئے ہیں بولے ہاں! یا رسول اللہؐ فرمایا خدا کی قسم ہے مجھے تمہارے موجودہ فقر و فاقہ کا کچھ ڈر نہیں۔ البتہ مجھے یہ خوف ہے کہ تمہیں دنیوی فارغ البالی نصیب ہو جائے جیسا کہ تم سے پہلی قوموں کو نصیب ہو چکی ہے اور تم بھی اسی طرح رشک و حسد کرنے لگو اور انہی کی طرح تم بھی لغویات میں مبتلا ہو جاؤ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مالی حرص و طمع اور اس کے نتائج کا آغاز ہوا اور حضرت عثمانؓ کے زمانے تک اس کی بدولت بغض و عداوت اور خانہ جنگی کی نوبت پہنچ گئی اور بعد کو تو مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ بنا پر مدتوں خانہ جنگی کا سلسلہ قائم رہا۔ چنانچہ اس زمانے میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے جو خلفائے بنو امیہ سے برسر جنگ تھے، مکہ میں ایک تقریر کی جس میں فرمایا کہ لوگو! نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ اگر انسان کو ایک ایسا میدان مل جائے جو سونے سے بھرا ہوا ہو تو اس کو تسکین نہ ہوگی بلکہ ایسا ہی دوسرا میدان بھی چاہے گا پھر اگر دوسرا مل گیا تو تیسرے کا خواستگار رہے گا انسان کے پیٹ کو صرف مٹی ہی بھر سکتی ہے۔ ان کی تقریر کا مقصد یہ تھا کہ اس وقت خانہ جنگیوں کا جو سلسلہ قائم ہے وہ صرف مالی حرص کا نتیجہ ہے اگر لوگ نبی کریمؐ کی اخلاقی تعلیم کے پابند رہتے تو یہ خون ریزیاں نہ ہوتیں۔

۲۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ ایک پیغمبر جو اپنی امت کو دنیا میں عزت کے ساتھ زندہ رکھنا چاہتا ہے اس کا سب سے بڑا اخلاقی فرض یہ ہے کہ وہ اپنی امت کے افراد میں مالی حرص و طمع کا ایسا مادہ پیدا نہ ہونے دے جو ترقی کر کے انہیں سوال اور گداگری کی طرف مائل کر دے اس بنا پر جہاں کہیں اس قسم کا موقع پیش آیا نبی کریمؐ نے اس قسم کے حرص و طمع کے مادے کو زائل کیا اور بجائے لینے کے مال کے دینے کی فضیلت بیان کی چنانچہ حضورؐ نے ایک دن حکیم بن حزام سے فرمایا اے حکیم! یہ مال ایک شاداب اور شیریں چیز ہے۔ جو شخص اسے کھلے ہوئے دل کے ساتھ لیتا ہے اسے برکت حاصل ہوتی ہے اور جو حرص کے ساتھ لیتا ہے اسے برکت حاصل نہیں ہوتی ہے اس کی مثال اس قسم کی ہے کہ ایک شخص کھاتا ہے مگر اس کا پیٹ نہیں بھرتا اور دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔"

حضرت حکیم بن حزام پر اس اخلاقی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ انہوں نے اسی وقت یہ عہد کر لیا کہ اب کسی سے کچھ نہ مانگوں گا۔ اور اس عہد کو اس شدت کے ساتھ پورا کیا کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو بیت المال سے وظیفہ دینے کے لئے

طلب کرتے تھے اور وہ انکار کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے بھی اپنے زمانہ میں ان کو وظیفہ دینا چاہا مگر انہوں نے واپس کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا مسلمانو! گواہ رہنا میں حکیم کو ان کا حق دیتا ہوں اور وہ قبول نہیں کرتے۔

۳۔ تیسرا سبب یہ تھا کہ ضروریات زندگی کے لیئے مال کی ایک مقدار بلاشبہ ضروری ہے اور اس حیثیت سے اسلام نے مال و دولت کی کوئی برائی نہیں کی البتہ قومی، مذہبی سیاسی اور تعلیمی کاموں کی بنیاد صرف مال پر ہی نہیں رکھنا چاہیئے کہ اگر مال و دولت ہے تو یہ کام انجام پائیں گے اور میں کمی ہو جائے تو سرے سے یہ کام ہی چھوڑ دیئے جائیں یا کم از کم بددلی کے ساتھ کیئے جائیں بلکہ ان کاموں کی اصلی بنیاد خلوص، صداقت، ایثار اور مخلوق کی نفع رسانی پر رکھنی چاہیئے اور مال و دولت کو ان مقاصد کی تکمیل کا ایک ذریعہ بنانا چاہیئے اسی بنا پر نبی کریمؐ نے خود غرض اشخاص کو مال و دولت کے غلام کا لقب دیا فرمایا: "دینار و درہم، چادر اور کمبل کے بندے ہلاک ہوں کہ اگر ان کو چیزیں دی جائیں تو خوش رہیں اور اگر نہ دی جائیں تو روٹھ جائیں۔"

یہ حدیث واقعات کے لحاظ سے بھی اسلام کی ابتدائی تاریخ سے تعلق ہے کیونکہ حضور کریمؐ کے عہد مبارک میں کفار سے لڑائیاں ہوئیں ان میں بہت سا مال غنیمت ملا۔ جو باہم تقسیم کیا گیا لیکن ان لڑائیوں کا مقصد مالِ غنیمت حاصل کرنا نہ تھا بلکہ اعلائے کلمۃ اللہ یعنی اشاعتِ اسلام تھا تاہم ان لڑائیوں میں بدو اور دیگر افتادہ قبائل کے لوگ بھی شریک ہوتے تھے اور زیادہ تر اپنی نظر مالِ غنیمت پر رکھتے تھے۔ اس لیئے اگر ان لوگوں کو مال غنیمت سے حصہ ملتا ہے تو خوش ہوتے تھے ورنہ شکوہ شکایت کرتے تھے۔

۴۔ چوتھا سبب یہ تھا کہ اسلام کے نزدیک مال بذاتِ خود کوئی بُری چیز نہیں بلکہ اسے "خیر" کہا گیا۔ البتہ اس کا غلط اور مسرفانہ استعمال نہایت خطرناک نتائج پیدا کر سکتا ہے چنانچہ ایک بار حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ تمہاری نسبت مجھے زیادہ خوف زمین کی برکتوں سے ہے صحابہ نے عرض کیا زمین کی برکتوں کا کیا مطلب ہے فرمایا دنیا کی زینت یعنی عمدہ کپڑے عمدہ سامان لہلہاتی ہوئی کھیتیاں سرسبز و شاداب باغ وغیرہ۔ اس پر ایک صحابی نے کہا کیا بھلائی سے بُرائی بھی پیدا ہو سکتی ہے؟

سوال نہایت اہم اور پیچیدہ تھا آپ خاموش ہو گئے پھر آپ نے فرمایا کہ بھلائی سے تو صرف بھلائی ہی پیدا ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ایک حقیقت ہے کہ مال ایک "شیریں چیز" ہے اور دیکھو کہ فصل بہار میں جب زمین میں گھاس اُگتی ہے تو اسے ایک جانور ضرورت سے زیادہ کھا لیتا ہے یہاں تک کہ اس کا پیٹ پھول جاتا ہے اور وہ تخمہ سے مر جاتا ہے لیکن دوسرا جانور اسی کو اعتدال سے کھاتا ہے جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو جگالی کرنے لگتا ہے اور دھوپ میں گھومتا پھرتا ہے اس طرح جب وہ ہضم ہو چکتا ہے تو دوبارہ پھر کھانا شروع کر دیتا ہے اور اس کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ یہ مال بھی اسی قسم کی چیز ہے جو شخص مال کو اس کے حق سے لیتا ہے اور اس کے حق میں صرف کرتا ہے تو وہ ایک امانت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اگر بغیر حق کے لیتا ہے تو اس کی مثال اس شخص کی ہے جو کھاتا ہے مگر

آسودہ نہیں ہوتا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمرؓ دعا مانگتے تھے کہ۔ خدا وندا ہم میں یہ قدرت تو نہیں ہے کہ ان فطری دلچسپیوں سے خوش نہ ہوں البتہ ہم کو یہ توفیق دے کہ ہم ان چیزوں کو ان کے حق میں صرف کریں، شراح حدیث اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ مال و دولت سے فطری وابستگی تو ہر شخص کو ہے لیکن باہم اس میں لوگوں کے تین درجے قائم ہو جاتے ہیں۔

۱۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جن پر مال و دولت کی بارش ہوتی ہے اور وہ لوگ اپنے اختیار سے جہاں چاہیں اس کو صرف کر سکتے ہیں لیکن باوجود اس کے کہ وہ مال و دولت پر لات مار دیتے ہیں اور سیم و زر کو چشم حقارت سے دیکھتے ہیں اسی درجہ کا نام مقام محمود ہے اور حضور اکرم کو یہی درجہ حاصل تھا اور حضرت عمرؓ اس درجے کے لئے دعا مانگتے تھے۔ چنانچہ ایک بار ان کے پاس مشرق سے بہت سامان آیا لوگوں کو بلا کر سب کے سامنے کھلوایا اس میں کثرت سے زیورات، جواہرات اور ساز و سامان نکلا اسے دیکھ کر حضرت عمرؓ رو پڑے لوگوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا جس قوم میں مال و دولت کی فراوانی ہوتی ہے وہ آپس میں نحوت ریزی کرنے لگتی ہے اور ہر شخص دوسرے کی عزت و آبرو کے درپے ہو جاتا ہے پھر سب سامان تقسیم کر دیا۔

۲۔ دوسرا درجہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو مال و دولت کو چشم حقارت سے تو نہیں دیکھتے لیکن اس کے صرف کرنے میں شریعت کے اوامر و نواہی کا لحاظ رکھتے ہیں یعنی جائز موقع پر تو صرف کرتے ہیں اور ناجائز مصارف سے بچتے ہیں اور یہ درجہ بھی مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے کوئی قابل اعتراض نہیں۔

(۳)۔ تیسرا درجہ ان لوگوں کا ہے جو شب و روز روپیہ ہی کی فکر میں محو رہتے ہیں اور اس کے حاصل کرنے میں جائز و ناجائز ذرائع کی پروا نہیں کرتے بلکہ ظالمانہ اور غاصبانہ طریقہ پر روپیہ حاصل کرتے ہیں اور مسرفانہ اور عیاشانہ طریقہ پر اس کو صرف کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جن کو شریعت نے بندگان درہم و دینار کا لقب دیا ہے اور اخروی بلکہ دنیوی ہلاکت کا مستحق ٹھہرایا ہے ان کی بھی حوصلہ و ہمت اور حالت و حیثیت کے لحاظ سے دو قسمیں ہیں۔

ایک تو وہ جو ادنیٰ درجہ سے تعلق رکھتے ہیں اور معمولی معمولی چیزوں پر جان دیتے ہیں، دوسرے وہ جن کی ہمتیں بلند اور اختیارات وسیع ہوتے ہیں اور ان کی نگاہوں میں لاکھوں کی بھی کوئی وقعت نہیں ہوتی مثلاً شاہان روم و ایران جو حضورؐ کے زمانہ میں رعایا سے مالگزاری اور ٹیکس وغیرہ سے ظالمانہ طور پر کروڑوں وصول کرتے تھے اور اسے بے دریغ عیش و عشرت میں خرچ کر ڈالتے تھے یہ دونوں سلطنتیں عرب کے پہلو میں واقع تھیں اور عرب ان سے تجارتی تعلقات رکھتے تھے۔ اس لئے اہل عرب پر ان کا اخلاقی اور معاشرتی اثر پڑتا تھا۔

ان اثرات و تعلقات کی بنا پر خود مسلمانوں کی نسبت یہ خوف تھا کہ اگر قیصر و کسریٰ کی دولت ان کے جیب و دامن میں آ گئی تو وہ بھی اسی قسم کی مسرفانہ عیش پرستیوں میں مبتلا ہو جائیں گے اور اسلام کا یہ زریں اخلاقی اصول کہ مال کو حق کے ساتھ لو اور حق کے ساتھ صرف کرو قائم نہ رہ سکے گا۔

اس لئے اسلام نے مسلمانوں کے متوسط درجہ کو سادہ زندگی

بسر کرنے کی ہدایت کی اور ان تمام سامان تعیش کو جو رومیوں اور ایرانیوں کے جزو زندگی بن گئے تھے ناجائز قرار دیا۔

چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "حریر و دیبا پہنو نہ سونے چاندی کے برتن میں پانی پیو۔ اور سونے چاندی کی طشتریوں میں کھاؤ۔" نیز فرمایا جو شخص سونے چاندی کے برتن میں پانی پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ کے گھونٹ اتارتا ہے۔"

شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں کہ ان چیزوں کے حرام کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انتہائی عیش پرستی اور انتہائی نزاکت و نفاست کو جو انسان کو بالکل دنیا کی طرف مائل کر دے ناپسند کرتا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے معمولی عیش پرستی کی یہ تعریف کی ہے کہ "عمدہ چیزوں کا انتخاب اور بُری چیزوں سے اجتناب" اور اسلام اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ بلکہ اسلام تعلیم دیتا ہے کہ صاف کپڑا پہنو میلا نہ پہنو۔ لیکن انتہائی عیش پرستی یہ ہے کہ مثلاً ایک ہی جنس کی چیزوں میں عمدہ ترین چیز کے انتخاب پر جان دینا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ تباہی کا اصل سبب یہی عیش پرستی ہے

دیسی کپڑوں اور دوسری چیزوں کو چھوڑ کر جو لوگ ولایتی کپڑے کے بغیر استعمال کرنا گوارا نہیں کرتے اور دیسی چیزوں سے ناک چڑھاتے ہیں تو اس کا سبب یہی انتہائی عیش پرستی ہے، امیروں اور رئیسوں اور ان کی دیکھا دیکھی متوسط طبقہ میں مقابلہ درحقیقت اسی قسم کی عیش پرستی میں ہوتا ہے۔

غرض ایک ہی جنس کی چیزوں میں اسی قسم کے مختلف درجے قائم کیئے جائیں تو اس کثرت سے مدارج نکلیں گے کہ انسان کا دماغ ان کی جستجو میں اور انسان کا مال ان کی خرید میں ہمیشہ تباہ ہوتا رہے گا۔

(چنانچہ حال ہی میں ایک رئیس نے امریکہ سے ایک لاکھ بیس ہزار روپے میں ایک کتا منگایا ہے)

اس لیئے اسلام نے اس پریشان خیالی کو دور کرنے کے لیے ایک متوسط درجے کی زندگی اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔ اور انتہائی عیش پرستی کی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔

(بشکریہ ماہنامہ معارف)

☆۔ اسلام نہ ترک تعلقات کی تعلیم دیتا ہے نہ انہماک فی الدنیا کی اجازت دیتا ہے بلکہ تعلقات میں اختصار کی تعلیم دیتا ہے۔

☆۔ جس قدر نظر وسیع ہوتی جاتی ہے۔ اعتراض کم ہوتا جاتا ہے۔

(ا۔ ع۔ ت)

از جناب پنڈت سندر لال آستانہ دہلی

پیغمبر اسلام کی شادیاں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہ شادیاں ہوئیں جن میں سے پہلی بیوی اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور حضرت زینب ام المساکین کا انتقال آپؐ کے سامنے ہوا۔ باقی نو بیویاں آپؐ کے وصال تک زندہ تھیں۔ اس پہلو پر دشمنانِ اسلام خاص کر متعصب عیسائیوں نے ایک آڑ بنا کر جناب مصطفےٰؐ اور اسلام پر نہایت تعصب اور عناد و بغض اور کینہ سے نکتہ چینی کی جس کے جوابات حقائق کی روشنی میں دیئے گئے اور اس قدر مطمئن کن تھے کہ ایمان و انصاف اور دیانتداری کے جذبہ کے تحت نامسلم محققین نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ پنڈت سندر لال کا یہ مضمون اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے آئیے ایک نامسلم کا عقیدہ حضورؐ کے ساتھ دیکھیں۔ افسوس کہ موجودہ دور کا مسلمان اس قدر پست ذہنیت ہے کہ وہ پنڈت سندر لال صاحب کا سا عقیدہ بھی نہیں رکھتا۔ آج کے ایک سید صاحب کو یہ کہتے سنا کہ پیغمبر اسلام ؑ نے بھی کثیر شادیاں عیش کے لئے کی تھیں" العیاذ باللہ۔ میں ایک ہندو مؤرخ کا مضمون نقل کر رہا ہوں شاید پڑھنے والے کی تسکین کا باعث بن سکے۔

(محمد اکرم عفی عنہ) "مدیر"

محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پہلی شادی ۲۵ سال کی عمر میں ہوئی اس ۲۵ سال تک عرب اور خاص کر مکہ کی گری ہوئی ہوا میں بھی محمد صاحب کا جیون بے داغ رہا جبکہ ان کی عمر کے لڑکے عیش و آوارگی میں اپنا وقت کھوتے تھے محمدؐ صاحب یا تو پہاڑ پر اکیلے بکریاں چرایا کرتے یا ایکانت میں بیٹھے سوچا کرتے تھے۔ محمدؐ صاحب کی اس زمانے کی نیک چلنی پر آج تک کوئی انگلی نہیں اٹھا سکا۔

پچیس سال سے پچاس سال کی عمر تک انہوں نے اپنی پہلی بیوی خدیجہؓ سے جو ان سے ۱۵ سال بڑی تھیں اپنا دھرم سچائی سے نبھایا۔ ایک آدمی کی بہت سی بیویوں کا

رواج سارے پورے عرب اور اس زمانہ کے قریب قریب سارے دیشوں میں اتنا عام تھا کہ محمد صاحب کے علاوہ ان دنوں ملک کے بڑے لوگوں میں شاید کم ہی ایسے رہے ہوں گے جن کی ایک ہی بی بی ہو۔

ان دوسرے ۱۳ سالوں کے بارے میں ایک مورخ اتہاس کار لکھتا ہے:-

"پچیس سال تک محمد صاحب اپنی بڑی عمر کی بی بی کے ساتھ وفاداری سے رہے جب وہ پینسٹھ سال کی تھیں تب بھی وہ ان سے ویسا ہی پریم کرتے تھے جیسا اس وقت جب ان کی شادی ہوئی تھی ان تمام پچیس برس کے اندر محمد صاحب کی نیک چلنی کے خلاف کہیں کسی طرح کا سانس تک نہیں سنائی دیا اس وقت تک کی ان کی زندگی کو خوب غور کے ساتھ شیشے سے دیکھنے پر بھی کوئی دھبہ دکھائی نہیں دیتا۔ خدیجہؓ کے مرنے کے بعد زندگی کے آخری ۱۳ سال میں ان کی نو اور شادیاں ہوئیں[1] ان نو شادیوں کے بارے میں وہی اتہاس کار لکھتا ہے:- ان میں سے کچھ شادیاں تو اس خیال سے کی گئیں کہ کچھ عورتوں کے خاوند اسلامی لڑائیوں میں مارے گئے تھے ان کا کوئی سہارا باقی نہ رہا تھا۔ محمد صاحب نے ان کے خاوندوں کو جوش دلا کر لڑائی میں بھیجا تھا ان بیواؤں کو حق تھا کہ محمد صاحب کا آسرا چاہیں اور محمد صاحب کافی دیالو تھے باقی شادیوں کا صرف راج کاجی تھا یعنی ایک دوسرے کے خلاف دلوں کے سرداروں کی ایک پریم ڈور میں باندھنا۔"

یہ بات بھی دھیان میں رکھنی چاہئے کہ ان کلا دنوں عرب میں کوئی بھی عزت والی عورت بنا شادی کئے کسی بھی دوسری صورت میں کسی دوسرے کے گھر میں رہنا پسند نہ کرتی تھی۔

ایک دوسرا اتہاس کار لکھتا ہے "چال چلن کے خیال سے محمد صاحب بڑے اونچے درجے کے آدمی تھے۔ جیون کی گہرائی میں وہ اتنے گہرے گئے ہوئے تھے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنی طاقت کو بھوگ بلاس میں کھو ڈالتے وہ سمجھتے تھے کہ اپنے اثر اور طاقت کو پکا کرنے کے لئے شادی ایک زبردست ذریعہ ہے کنکھجورے کی ہزار ٹانگوں کی طرح شادی جگہ جگہ اپنی بانہیں پھیلا دیتی ہے اور ایسے ایسے ناطے اور رشتے جوڑ لیتی ہے جنھیں وہ ایسے چاٹ جاتی ہے جیسے گھونگا چٹان کو یا بے تابی مچھلی تنکا کو۔" قریب قریب ہمارے زمانہ تک یہی اصول یورپ کے راج کاج کا ایک بڑا حصہ رہا ہے۔ یہی غرض تھی جس نے محمد صاحب کو کئی شادیوں کے لئے تیار کیا۔ محمد صاحب کے بڑے مشن کا یہ ایک ضروری حصہ تھا۔ محمد کا ان نو شادیوں کا تھوڑے میں حال یہ ہے۔

خدیجہؓ کے بعد محمد صاحب کی شادی ان کے جیون بھر کے ساتھی حضرت ابوبکرؓ کی لڑکی عائشہؓ کے ساتھ ہوئی۔ عائشہؓ کنواری

---

[1] رسول اللہ ﷺ نے ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے انتقال کے بعد نو کی بجائے دس شادیاں کیں حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت زینبؓ ام المساکین، حضرت ام سلمہؓ، حضرت زینب بنت جحشؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت صفیہؓ۔ [illegible] کو حضرت زینبؓ بنت جحش اور حضرت زینبؓ ام المساکین کے نام کی وحدت کی وجہ سے سہو ہو گیا ہے کیونکہ حضرت زینبؓ ام المساکین کا تذکرہ نہیں کیا گیا ان کی شادی عبداللہ بن جحش سے ہوئی اور ان کی شہادت جنگ احد میں ہونے کے بعد حضورؐ سے شادی ہوئی آپ مساکین کا بہت خیال رکھتی تھیں اس لئے نام ام المساکین پایا۔ (ادارہ)

تھیں۔ ان کی عمر ۴۰ سال تھی حضرت ابوبکرؓ نے اپنے تن من دھن
سے مصیبت کے وقت اسلام کی بڑی سیوہ کی تھی۔ خدیجہؓ کے مرنے
کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے دل میں یہ بات جم گئی کہ میری بیٹی
پیغمبرؐ کو بیاہی جائے۔ انہوں نے بڑی ضد کے ساتھ پیغمبر سے
پرارتھنا کی عرب میں کسی ایک کی اس طرح پرارتھنا کو ٹھکرا دینا
اس کی بڑی ہینی سمجھی جاتی تھی محمدؐ صاحب نے اس پرارتھنا کو
مان کر حضرت ابوبکرؓ کو ہمیشہ کے لئے اپنا احسان مند بنا لیا
اور ساتھ ہی دونوں خاندانوں کو بھی ہمیشہ کے لئے ایک کر دیا
اس کے بعد زندگی بھر انہوں نے اور کسی بھی کنواری کے ساتھ
شادی نہیں کی تیسری شادی ایک غریب بڑھیا حضرت سودہؓ
کے ساتھ ہوئی سودہؓ محمدؐ صاحب کے ایک شروع کے ساتھی
سکران کی بیوی تھیں قریش کے ظلموں سے بچنے کے لئے وہ اپنے
پتی کے ساتھ ابھی سینیا چلی گئی وہاں سکران مر گیا اور سودہؓ واپس
مکہ آ گئی لیکن کوئی اس کی مدد کرنے والا اور پوچھنے والا نہ تھا
رشتہ داروں نے پالنے سے انکار کر دیا۔ بوڑھی اور لاچار
سودہؓ کی پرارتھنا پر محمدؐ صاحب نے اس سے نکاح پڑھ کر
اس کو اپنے گھر میں رہنے کی راہ نکال دی۔ چوتھی شادی حضرت
عمرؓ کی بیوہ لڑکی حفصہؓ کے ساتھ ہوئی حفصہؓ کا خاوند بدر
کی لڑائی میں مارا گیا (جنگ بدر میں حضرت حفصہؓ کے شوہر
حضرت خنیسؓ زخمی ہوئے تھے اور بعد میں انہی زخموں کی وجہ
سے وفات ہوئی) حضرت عمرؓ نے اپنی بیوہ لڑکی کی شادی
پہلے کسی اچھے مسلمان سے کرنی چاہی انہوں نے حضرت عثمانؓ
سے کہا مگر انہوں نے انکار کر دیا پھر حضرت ابوبکرؓ سے ذکر کیا
مگر انہوں نے بھی خاموشی اختیار کی جس سے حضرت عمرؓ کو بے حد
رنج ہوا حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ کا رتبہ مسلمانوں میں

بہت اونچا تھا حضرت عمرؓ تیز مزاج تھے انہوں نے ان انکاروں
کو بھی اپنی بے عزتی سمجھا لکھا ہے کہ سارے مسلمانوں میں جھگڑا پھیلنے
کا ڈر تھا محمدؐ صاحب کو پتہ چلا حضرت عمرؓ کو ٹھنڈا کرنے اور
جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے حفصہؓ کے ساتھ خود بیاہ
کر لیا۔ پانچویں شادی احد کی لڑائی کے ایک سال بعد امیر کی
لڑکی ہندہ سے ہوئی امیر بڑا اثر والا آدمی تھا اور احد کی لڑائی
میں ہندہ کا خاوند گھائل ہو گیا اور آٹھ مہینے بعد مر گیا بیوہ ہندہؓ کے
کئی بچے تھے جن کے پالنے کے لئے وہ تیز مزاج اور اپنی مشہور
تھی۔ اس کے سب سے بڑے بیٹے کا نام سلمیٰ تھا جس کی وجہ سے
وہ ام سلمہؓ کہلاتی تھی دکھی ہو کر اس نے خود محمدؐ صاحب سے
نکاح کی پرارتھنا کی انہوں نے مان لیا اور اسے اور اس کے
بچوں کو پال لینے کا ذمہ لیا چھٹی شادی (یہ ساتویں شادی ہے)
اس طرح ہوئی کہ زینبؓ ان کی پھوپھی کی لڑکی تھی اور زینب کے
باپ حبش (صحیح نام جحش ہے) قریش کی دودان شاخ سے تھا
یہ بنی دودان اسلام کے مشہور دشمن ابوسفیان کے نزدیکی رشتہ دار
تھے لیکن محمدؐ صاحب اور اسلام سے اتنا زیادہ پریم رکھتے تھے کہ
ہجرت کے وقت سب کے سب مرد عورت اور بچے گھروں کے تالے لگا کر
مدینہ چلے آئے ابوسفیان کو غصہ کرنے کے لئے اس خاندان کی مدد
محمدؐ صاحب کے لئے بڑی قیمتی تھی۔ مدینہ پہنچنے کے بعد زینبؓ کے
والدین نے اس کی شادی محمدؐ صاحب سے کرنا چاہی مگر انہوں نے
انکار کر دیا قریش میں خاندان کا بڑا گھمنڈ تھا محمدؐ صاحب اس
گھمنڈ کو توڑنا چاہتے تھے اور آدمی آدمی کو برابر کرنا چاہتے تھے
انہوں نے بنی دودان کو ملانے کی وجہ سے زینب کی شادی زید
سے کر دی زید وہ غلام تھے جسے محمدؐ صاحب نے آزاد کیا
تھا۔ گھمنڈی بنی دودان کو یہ بات پسند نہ آئی مگر محمدؐ صاحب کے

لہ (۱) پانچویں شادی حضرت زینبؓ ام المساکین کے ساتھ ہوئی اور چھٹی ہندہ سے اور ان کے غلام کا نام سہیل ہے اور ابو امیہ کنیت۔

کہنے سننے پر انہوں نے زینبؓ کی شادی زیدؓ سے کر دی۔ زینبؓ کے دل سے نسلی گھمنڈ مٹ نہ سکا۔ ایک گورے عرب سردار کی لڑکی اور ایک غلام سے بیاہی جائے یہ اس سے سہا نہ جاتا تھا دونوں کا جیون سکھ نہ تھا تھک کر زیدؓ نے زینبؓ کو طلاق دینا چاہا اس نے محمدؐ صاحب سے اجازت مانگی مگر محمدؐ صاحب نے پوچھا، تو نے زینب میں کوئی برائی دیکھی؟ زیدؓ نے جواب دیا نہیں لیکن میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ محمدؐ صاحب نے غصہ سے کہا جا اپنی بی بی کو اپنے ساتھ رکھ اور اللہ سے ڈر۔ لیکن اس ڈانٹنے سے زیادہ عرصہ کام نہ چل سکا اور آخر زیدؓ نے زینبؓ کو طلاق دے دیا۔ زینبؓ اپنے باپ کے گھر واپس آگئی باپ نے ایک دوسرے کے لوگوں سے زینبؓ کی دوسری شادی کرنا چاہی لیکن کسی نے بھی ایسی عورت سے شادی کرنا نہ چاہا جو ایک غلام کی بیوی رہ چکی تھی جبھی دوران کو اس میں اپنی بڑی ہیٹی دکھائی دی انہوں نے پھر محمدؐ صاحب سے زینبؓ کو اپنے نکاح میں لینے کی پرارتھنا کی محمدؐ صاحب نے زیدؓ اور زینبؓ کو بلا کر پھر سے ان میں صلح کرانے کی کوشش کی مگر کوئی پھل نہ ہوا محمدؐ صاحب کے لیئے کوئی چارہ نہ تھا۔ انہوں نے زینب کے ساتھ نکاح کر لیا۔ زینبؓ کی عمر اس نکاح کے وقت پینتیس سال سے اوپر تھی۔

ساتویں شادی ایک بیوہ جویریہؓ سے ہوئی جویریہؓ کا باپ حارث بنی مصطلق قبیلہ کا سردار تھا مدینہ سے دو سو میل دور سمندر کے کنارے حارث مارا گیا اس قبیلہ کے کوئی دو سو آدمی مسلمانوں نے پکڑ لیئے بنی مصطلق نے صلح چاہی عرب قبیلوں یا دلوں میں صلح کی ایک ضروری شرط ان دنوں ہارے ہوئے قبیلہ کی طرف سے یہ ہوتی تھی کہ جیتے ہوئے قبیلہ کا کوئی خاص آدمی ہارے ہوئے قبیلہ کی کسی عورت سے شادی کرے اسی رواج پر زور دے رہا ہے ہارے ہوئے یونانی سردار سلیوکس نے جیتے ہوئے موریہ چندر گپت سے صلح کے وقت اس بات کی ضد کی کہ چندر گپت سلیوکس کی ایک لڑکی سے شادی کر لے اور چندر گپت کو ماننا پڑتا۔ محمدؐ صاحب نے بنی مصطلق کی پرارتھنا پر ان کے سردار حارث کی بیوہ لڑکی جویریہؓ کے ساتھ جس کا خاوند لڑائی میں مارا گیا تھا۔ شادی کر کے اس سارے قبیلہ کو مسلمانوں کے ساتھ پریم ڈور میں باندھ لیا۔ اس شادی سے دو سو مصطلق قیدی بنا کسی شرط کے ایکدم چھوڑ دیئے گئے بعد جویریہؓ کی اس شادی کی بات کرتے ہوئے محمدؐ صاحب کی دوسری بی بی (حضرت) عائشہؓ نے کہا تھا کوئی عورت کبھی اپنے قبیلہ والوں کے لیئے اس سے بڑی برکت ثابت نہیں ہوئی جتنی جویریہؓ اپنے لوگوں کے لیئے ٹھیک اسی طرح خیبر کی لڑائی کے بعد محمدؐ صاحب نے آٹھویں شادی (در حقیقت نویں شادی تھی) یہودی قبیلہ بنو قریظہ کے سردار اخطب کی بیوہ لڑکی صفیہؓ

ـلہ: ابن اسحاق نے مغازی میں آٹھویں شادی کا واقعہ اس طرح سے بیان کیا کہ حضرت جویریہؓ کے باپ حارث نے مدینہ پر فوج کشی کا ارادہ کیا جو بنو المصطلق کا سردار تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ نے تحقیق حال کے لیئے حضرت بریدہ بن حصیب اسلمیؓ کو روانہ بھیجا انہوں نے اس خبر کی تصدیق کی اور حضورؐ نے دفاعی جنگ کا اعلان کیا باوائل ۲ شعبان کو مسلم فوجیں مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر [illegible] مریسیع میں مقام کیا حارث مقابلہ سے فرار ہو گیا لیکن اہل مریسیع نے [illegible] شروع کر دی مگر شکست کھائی [illegible] گرفتار ہوئے [illegible] اونٹ، [illegible] بکریاں مال غنیمت میں آئیں گرفتار ہونے والوں میں حارث کی بیٹی ام المومنین جویریہ بھی تھیں تقسیم کے وقت ثابت بن قیس کے حصہ میں آئیں [illegible] ابن سعد نے طبقات میں لکھا [illegible] حضور نے ان سے نکاح کر لیا [illegible] تمام صحابہ نے فیصلہ کیا کہ اس قوم کے تمام افراد کو رہا کر دیا جائے۔

کے ساتھ کی صفیہؓ کی دوبارہ شادی پہلے ہو چکی تھی اس کا خاوند خیبر کی لڑائی میں مارا گیا تھا۔ نویں شادی (یہ دسویں شادی تھی) مکے کے حاکم اور اسلام کے دشمن قریش کے سردار ابو سفیان کی لڑکی ام حبیبہؓ کے ساتھ ہوئی۔ ام حبیبہؓ کا پہلا مرد اتھوپیا میں اپنے دیش سے دور مرا تھا۔ محمد صاحب کے ساتھ شادی ہونے سے پہلے ام حبیبہؓ کے کئی بچے تھے جن میں سے ایک لڑکی کا نام حبیبہ تھا بیاہ کی غرض بالکل صاف تھی۔

(یہ گیارہویں شادی تھی) دسویں اور آخری شادی ان دنوں مکہ میں ہوئی جب حدیبیہ کی صلح کے بعد محمد صاحب تین دن کی جاترا کے لئے مکہ گئے ہوئے تھے۔ یہ شادی ایک قریشی سردار حارث کی بیوہ لڑکی میمونہؓ کے ساتھ ہوئی تھی محمد صاحب نے اپنے ایک چچا کے زور دینے پر یہ شادی کی تھی اور چچا کی غرض پوری ہوئی یعنی اس شادی سے ولید کے بیٹے خالد اور عاص کے بیٹے عمرو جیسے دو زبردست دشمن محمد صاحب کی طرف ہو گئے۔

اپنی ان سب بیویوں کے ساتھ محمد صاحب کا برتاؤ ہمیشہ ایک سا رہا۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ اس وقت تک شاید دنیا کے کسی دیش میں بھی ایک آدمی ایک سے زیادہ بیاہ ہونا کسی طرح ناجائز سمجھا جاتا تھا اور محمد صاحب کی ان شادیوں کی غرض صاف تھی۔ محمد صاحب کے دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہوئیں دونوں لڑکے بچپن ہی میں مر گئے تھے تین لڑکیوں کی شادیاں انہوں نے عرب کے پرانے دھرم کے لوگوں میں کیں اور ایک لڑکی فاطمہؓ کی شادی حضرت علیؓ سے کی۔

سلہ: حضور کی بڑی لڑکی حضرت زینبؓ کی شادی ابو العاص سے ہوئی تھی جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔ دوسری صاحبزادی حضرت رقیہؓ کی شادی ابولہب کے بیٹے عتبہ سے ہوئی اور تیسری صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ کی شادی ابولہب کے دوسرے لڑکے عتیبہ سے ہوئی حضورؐ کے اعلان نبوت پر ابولہب نے بیٹوں کو مجبور کیا چنانچہ انہوں نے طلاق دے دی اور حضرت رقیہؓ کی شادی حضرت عثمانؓ سے ہوئی اور سنہ ۲ ہجری میں حضرت رقیہؓ کا انتقال ہو گیا تو سنہ ۳ ہجری میں حضرت ام کلثومؓ کی شادی بھی حضرت عثمانؓ غنی سے کر دی گئی۔ اسی لئے حضرت عثمانؓ کو ذوالنورین کہا جاتا ہے۔

ادارہ نقشبندیہ اویسیہ کی
کتب
اسلام آباد میں
"ماڈرن بک ڈپو"
آبپارہ سے دستیاب ہیں

سلہ۔ ام المومنین صفیہؓ کے والد کا نام حیی بن اخطب ہے جو بنی نضیر کا سردار تھا والدہ کا نام ضرہ تھا جو سموأل سردار بنو قریظہ کی بیٹی تھی شمال عرب کے یہودی قبائل سے یہ بے حد اہم اور ممتاز ہے۔

ایک خط ــــ اور اُس کا جواب

یہاں طرابلس میں پاکستانیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ چونکہ ہمارا آپس میں وطنی رشتہ کے علاوہ دینی رشتہ زیادہ قابلِ التفات ہے اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کہ "الدین النصیحۃ" (یعنی دین نام ہی خیر خواہی کا ہے) کے مطابق ہم دین سمجھنے اور دین پر عمل کرنے کے لئے آپس میں ملتے جلتے ہیں۔
دیکھا گیا ہے کہ ان لوگوں میں دینی حس خاصی بیدار ہے۔ چنانچہ ہمارے متعدد ساتھی دینی دعوت کو بخوشی قبول کرتے ہیں اور ان کی عملی زندگی میں نہایت صالح انقلاب دکھائی دے رہا ہے۔
ایک مسئلہ کے متعلق مجھے ذاتی طور پر واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور وہ ہے نور اور بشر کا مسئلہ اس پر کوئی مستند اور معلومات افزا کتاب ہو تو مجھے بھیجدیں۔

الجواب

عزیزم - کرنے کا کام یہی ہے جس کا آپ نے پہلے ذکر کیا ہے۔ عملی زندگی میں دین کی ضرورت اور دینی احکام پر عمل کرنے کی اہمیت واضح کر دینا بہت بڑا کام ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر دین کا فہم حاصل کرنا اور اس کے ذریعے اور تقاضوں کے مطابق عملی زندگی کی تشکیل کرنے کا عظیم الشان محل تیار ہو سکتا ہے۔
جہاں تک نور اور بشر کے مسئلہ کا تعلق ہے یہ بڑا سادہ سا مسئلہ ہے مگر بوجوہ اسے ایسا پیچیدہ بنا دیا گیا ہے کہ صرف اسی ایک مسئلہ سے کفر اور اسلام کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ موشگافیوں کا کام علماء کے لئے چھوڑ دیں آپ یار لوگوں کی تیار کی ہوئی اس دلدل میں پھنسنے سے پرہیز کریں۔
اگر آپ صرف یہ مسئلہ سمجھنا چاہیں تو میں آپ کے فن کی زبان میں وضاحت کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہاں آپ کا کاروبار یہ ہے کہ آپ بجلی کے کھمبے دور دراز تک نصب کرتے ہیں ان پر بجلی کے تار لگاتے ہیں اور H.T. لائین تیار کرتے ہیں آپ جانتے ہیں کہ H.T. لائین میں لوہے کے تار میں کئی سو واٹ کی طاقت کی برقی رو گزر رہی ہوتی ہے مگر کیا آپ کو وہ رو یا اس کا نور کہیں نظر آتا ہے یا جہاں سے وہ گذر رہی ہوتی ہے

اپنے ماحول کو روشن کرتی جا رہی ہے۔ آپ کہیں گے دونوں سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔ مگر جب یہی برقی نور مناسب طریقے سے بلب میں پہنچتا ہے تو یہ چھپا ہوا نور نظر آنے لگتا ہے اور ماحول کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ بلب کیا ہے ریت کے ذرات ہی تو ہیں جن کو شیشے کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ تو اس سے نتیجہ ظاہر ہے کہ تار میں نور کی لہر کے موجود ہونے سے انکار نہیں مگر اس نور کے ظہور نظر آنے کے لئے اور ماحول کو روشن کرنے کے لئے اسے بلب کے خول کی ضرورت ہے۔

بالکل اسی طرح سمجھ لیجئے کہ اوّل ما خلق اللہ نوری (یعنی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے میرا نور پیدا کیا) ایک حقیقت ہے مگر اس نور کو پیدا اس لئے کیا گیا کہ ماحول کو منور کر دے اس نور کا موجود ہونا مسلّم مگر عالم بشریت کو منور کرنے کے لئے بشریت کے بلب کی ضرورت تھی۔ بلب کا انکار کرو گے تو نور سے محروم ہو جاؤ گے۔ بلکہ اس نور کی تخلیق کا معاذ اللہ عبث ہونا بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ لہٰذا اس نور کی ضیاء پاشی کے لئے بشریت ناگزیر ہے۔

ایک اور صورت پیش کرتا ہوں اس کائنات میں جو مخلوق بستی ہے انسان کے علم کے مطابق وہ چھ قسم کی ہے، جمادات، نباتات، حیوانات، انسان، جن، فرشتہ۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ ساری قسمیں ایک ہی درجہ کی ہیں یا ان کے درجات میں کوئی فرق ہے؟ اپنے علم اور تجربہ سے ہم کچھ قسموں کو گھٹیا اور بڑھیا قرار دیتے ہیں۔ مگر کچھ دوسری قسموں کے بارے میں تردّد ہوتا ہے۔ تو اس تردّد کے رفع کرنے کی آسان صورت یہ ہے کہ خالق کائنات سے پوچھ لیا جائے اس کا ارشاد ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ۔ یعنی یقیناً ہم نے انسان کو بہت شرف بخشا۔

دوسرا ارشاد ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (یعنی ہم نے انسان کو بہترین صورت دے کر پیدا کیا) تو معلوم ہوا کہ کائنات کی ساری مخلوق میں یہ مسجود ملائک جسے بشر کہا جاتا ہے سب سے افضل ہے اسی وجہ سے نوع بشر کو اشرف المخلوقات کا لقب دیا گیا اب آپ ذرا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو سامنے رکھتے ہوئے عقل سلیم سے فیصلہ طلب کریں کہ یہ مناسب تھا کہ افضل الرسل کو اشرف المخلوقات کی نوع سے پیدا کیا جاتا یا یہ کہ کسی کم درجے کی مخلوق سے؟ تو جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ افضل الرسل کو اشرف المخلوقات ہی میں سے ہونا چاہیئے۔ اور یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ اشرف المخلوقات نوع بشر ہی ہے۔ باقی تمام انواع اس سے کم درجے کی ہیں لہٰذا افضل الرسل کا اشرف المخلوقات کا ایک فرد ہونا شرف و عظمت کی دلیل ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ افضل الرسل کی نوع بشر سے تخلیق ہونا بھی اس نوع کی عظمت کو چار چاند لگ گئے۔ حضور اکرم ؐ کو نوع بشر سے ہونا تسلیم نہ کرنے سے توہین کا پہلو نکلتا ہے کیونکہ جس اور نوع سے منسوب کریں گے وہ نوع بشر سے کم درجے کی ہو گی پھر سوچئے کہ اس میں حضور اکرم ؐ کی عظمت ظاہر ہوتی ہے یا توہین کا پہلو سامنے آتا ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ تار کہیں بلب سے باہر بھی

بعض اوقات مل جاتیں تو شعلہ پیدا ہوتا ہے اور وہ
نور ہی تو ہے جو ظاہر نظر آجاتا ہے ۔ بات درست ہے
مگر غالب کی بات یاد آگئی ہے

بجلی سی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

ایک سیکنڈ کے لئے ایک شعلہ کا ظاہر ہو جانا بھلا کہاں وجہ سکون بن سکتا ہے ۔ یہاں خواہش یہ ہوتی ہے کہ ے

اور عشرت کی تمنا کیا کریں
سامنے تو ہو تجھے دیکھا کریں

اس لئے اس نور کا صرف سامنے ہونا کافی نہیں سامنے رہنا بھی ضروری ہے اور اس کا باتیں کرنا اور عالم بشریت کے لئے اس کی باتیں سننا بھی ضروری ہے اس لئے یہاں صرف ایک وجود ہی کافی نہیں بلکہ بشریت کے مستقل ملبس کی ضرورت ہے تاکہ عالم بشریت منور ہوتا چلا جائے۔

ے غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمد است

میرے خیال میں اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے باقی جھگڑے ہی جھگڑے ہیں۔

لفظ "نور" کے مفہوم میں بھی کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اس لئے تھوڑی سی اس کی وضاحت بھی ہو جائے۔

نور کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) نور محسوس ۔ جو مشہود بالابصار ہے یعنی جس کو سر کی آنکھیں دیکھتی ہیں جیسے آپ کی بجلی۔

(۲) نور معقول ۔ جو مشہود بالبصائر والقلوب ہے یعنی جو چشم بصیرت اور دل کی آنکھ سے نظر آتا ہے سر کی آنکھیں اسے نہیں دیکھ سکیں۔

ان دونوں قسموں کا اپنا اپنا کام ہے۔

نور محسوس سے مادی چیزوں کی زندگی برقرار رہتی ہے یعنی مادیات کے لئے سامانِ زندگی ہے ـــ نور معقول سے حیات روحانی کا سامان ہوتا ہے ۔ نور معقول سے حیات روحانی کا سامان ہوتا ہے نور معقول سے تعلق منقطع ہو جائے تو روحانی موت واقع ہو جاتی ہے کہنے والے کے منہ سے سچی بات نکل گئی گو اس کے ذہن میں اس کا مفہوم کچھ ہی ہو ۔ میں اس کو اسی حقیقت سے وابستہ کرتا ہوں ے

زندگی آپ کی عنایت ہے
ورنہ ہم لوگ مر گئے ہوتے

عبدالرزاق عفی عنہ

ملفوظات

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رح

۱۔ سید احمد شہید بریلویؒ نے شاہ صاحب سے دریافت کیا لفظ (اللہ) کیا معنی رکھتا ہے۔
فرمایا منگل کے دن میں نے قُل ھُوَ اللہُ الخ کی تفسیر میں کہا تھا کہ اللہ ایک ایسی ذات کا نام ہے جو جامع جمیع صفاتِ کمالیہ ہے اور وہ حضرت حق جل مجدہ کی ذات ہے۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رح سے منقول ہے کہ یہی اسم اعظم ہے بشرطیکہ اس نام کے پڑھنے والے کے دل میں ماسوا کا دخل نہ ہو۔

۲۔ فرمایا تمام اسماء اسی اسم میں داخل ہیں پھر یہ آیت پڑھی۔
اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (آگاہ رہو کہ اللہ کے ذکر سے ہی دل اطمینان پذیر ہوتے ہیں)

۳۔ ایک مرید نے عرض کیا کہ بعض اعمال برائے دفع حاجات دینی و دنیوی جو احادیث میں آئے ہیں یا دعائیں وہ اس زمانے میں اپنی تاثیر کیوں نہیں دکھاتے۔
فرمایا علماء نے اس کا جواب تین طریقے سے دیا ہے۔
(۱) شرائط قبولیت مفقود ہیں جب شرط نہ پائی گئی تو مشروط بھی فوت ہوا۔
(۲) ان احادیث میں آیا ہے کہ اس دعا کا یہ خاصا ہے یہ نہیں آیا کہ خواہ مخواہ ایسا ہی ہوگا۔ اگر ہر دعا قبول کر لی جائے تو ایک محذورِ عظیم لازم آئے گا۔
(۳) تیسرا جواب یہ ہے اور یہی تحقیقی جواب ہے کہ کثرت ظلمات گناہ کے سبب سے نورانیت دعاء اپنا کھلا ہوا نتیجہ اور فائدہ برآمد نہیں کر سکتی دیکھو موسم برسات میں اگر اندر خشک جگہ میں بھی سامان رکھا ہو تو اس میں نمی اور تری کا اثر آجاتا ہے اور موسم خشک میں اس کے برعکس ہے اسی طرح جب فضا ظلمات معاصی سے پر ہوتی ہے تو استجابت دعا کم ہوتی ہے یا ہوتی ہے مگر مفہوم نہیں ہوتی۔

۴۔ فرمایا کچھ عرصہ ہوا ایک شخص درگاہ سلطان المشائخ میں وارد ہوا اس نے شہر کے بعض علماء سے سوال کیا کہ ایک نومسلم ہے وہ بعد قبول اسلام کس مذہب و مسلک کو اختیار کرے اور وہ کیسے جانے کہ کونسا مذہب حق ہے؟ اگر طلب علم کرے تو ایک مدت درکار ہے اور انجام کے لحاظ سے خطرات ہیں ہر شخص نے مختلف جواب دیا۔ ایک جواب یہ دیا گیا کہ فریقین کی متفق علیہ اور مختار باتوں کو اختیار کر کے تحصیل علم کرتا رہے

اس کے بعد جس راستے کو اچھا جانے اسی پر چلے۔ آخر یہ مسئلہ بندہ کے پاس آیا لوگ سائل کو بھی ہمراہ لائے میں نے کہا وہ نو مسلم چھ باتوں سے جان لے کہ مذہب حق کونسا ہے۔

(۱) یہ دیکھے کہ مکہ جہاں خانۂ خدا ہے وہاں کونسا طریقہ جاری ہے۔ اور کونسا طریقہ ناپید ہے۔

(۲) مدینہ (جہاں محمد رسول اللہ آرام فرما ہیں) یہ کونسا مذہب جاری ہے۔

(۳) قرآن کس کو محفوظ ہوتا ہے اور کس کو نہیں۔

(۴) اولیاء اللہ کس فرقے میں ہوتے رہے ہیں۔

(۵) عید وجمعہ کا اہتمام کہاں ہے۔

(۶) یہاں (ہندوستان میں) جہاد فی سبیل اللہ کس نے رائج کیا۔

۵- فرمایا مقصد چشتیاں قوت عشق کا بروئے کار لانا اور ابھارنا ہے۔ اس کے لئے جو امور ممد ومعاون ہوں ان کو اختیار کرتے ہیں مثلاً ذکر جہر وغیرہ اور اس کے لئے جو چیزیں مضر ہیں ان سے اجتناب کرتے ہیں وہ کہتے ہیں جب عشق حاصل ہوگا "حضور وانکسار" وغیرہ سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔

مقصد نقشبندیاں احضار نقش دلدار اور تصحیح خیال ہے۔ لہذا جو چیزیں اس کے لئے معاون ہیں ان کو اختیار کرتے ہیں اور جو مضر ہیں ان سے پرہیز کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ "استقرار حضور" سے فنا بقا اور عشق سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔

مقصد قادریاں تصقیل (صیقل کرنا) اور انکسار نفس ہے وہ کہتے ہیں جب دل صاف ہوگیا تو اس کے مقابل میں جو کچھ ہے وہ جلوہ گر ہو جائے گا۔

۶- فرمایا توجہ چار قسم کی ہوتی ہے۔

(۱) انعکاسی۔ یہ تمام طرق میں ہے جب ایک قلب دوسرے قلب کے مقابل ہو تو اس کا اثر ہوتا ہی ہے جب آئینہ کسی چیز کے مقابل ہو۔ تو وہ چیز بے ارادہ اس میں جلوہ گر ہو جاتی ہے اس توجہ انعکاسی کے لیئے فقط طالب کی صفائی قلب درکار ہے۔

(۲) القائی:- جیسے ایک برتن کی چیز دوسرے برتن میں انڈیلیں اس میں قصد وارادہ شرط ہے

(۳) جذبی:- اس میں قلب طالب کو کھینچکر اپنے قلب کے تحت رکھتے ہیں اس تدبیر سے وسعت اثر ہو جاتا ہے۔ جیسے ایک خشک کپڑا ایک تر کپڑے کے نیچے آجائے تو ضرور تر ہو جاتا ہے۔

۴۔ اتحادی:۔ کہ مرشد کے اوصاف بھی مرید میں سرایت کر جاتے ہیں۔

۷۔ فرمایا بزرگ چار قسم کے ہوتے ہیں۔

(۱) سالک مجذوب:۔ کہ اول سلوک اختیار کیا بعد ازاں جذب کی نوبت آئی یہ بہترین قسم ہے۔

(۲) مجذوب سالک: پہلے ایک قسم کے جذب سے سرفراز ہوئے بعد ازاں سلوک اختیار کیا۔

(۳) سالک محض: جو جذب سے مشرف نہیں ہوئے ہیں۔ مجذوب محض: جن کی عقل غلبہ تجلی حق کی وجہ سے سلب ہو جاتی ہے۔

۸۔ ایک مرید نے عرض کیا جذب و سلوک کے کیا معنی ہیں۔

فرمایا: سلوک تو اجتہادات کسب (کوشش وجد و جہد) کا نام ہے اور جذب عنایت خداوندی ہے جو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

۹۔ ایک مرید نے عرض کیا کہ تمام افعال خلاف شرع، راہ سلوک کو بند کرتے ہیں یا بعض؟

فرمایا ــــ کہ تکدر تو تمام اعمال خلاف شرع سے پیدا ہوتا ہے لیکن بعض اعمال ایسے ہیں کہ نسبت مع اللہ کا بیج بھی نہیں چھوڑتے جیسے مکر، فریب، نخوت، تکبر، خود نمائی، طلب دنیا اور طلب جاہ وغیرہ۔ اور بعض کبائر ایسے ہیں کہ اگر شاذ و نادر کبھی سرزد ہو جائیں تو ایسا ہی نسبت ختم نہیں کرتے۔ بعض اعمال ایسے ہیں جن سے نسبت کی نورانیت قدرے ظلمت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ صغیرہ گناہ بے قصد و بے ارادہ۔

۱۰۔ فرمایا ــــ تمام سلسلے اچھے ہیں اور ہر شخص اپنے سلسلے پہ ناز کرتا ہے اور سب نے آداب و قواعد سلوک بیان کئے ہیں لیکن بزرگان نقشبندیہ نے قواعد سلوک کو خوب درست کیا ہے۔

۱۱۔ ایک مرید نے پوچھا کہ حضرت عائشہؓ یا حضرت فاطمہؓ نے کبھی عورتوں کی امامت کی ہے۔

فرمایا نہیں۔ بلکہ امامت نساء کے مکروہ ہونے کی وجہ یہی ہے۔

۱۲۔ فرمایا۔ خوارج، سوائے حضرات شیخینؓ کے باقی سب سے عداوت رکھتے ہیں۔

۱۳۔ فرمایا۔ حضرت علیؓ کے اُنیس صاحبزادے تھے۔ پانچ صاحبزادے حضرت حسینؓ کے ہمراہ شہید ہوئے۔ اور حضرت حسنؓ کے ۹ صاحبزادے تھے۔

۱۴۔ فرمایا ــ حضرات قدماء چشتیہ نے مزامیر کے ساتھ سماع نہیں سنا۔ چنانچہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء دہلوی جو سماع کے عاشق تھے۔ فرمایا کرتے تھے جو شخص مزامیر کے ساتھ سماع سُنے وہ میری محفل میں نہ آئے۔

۱۵۔ فرمایا۔ سلطنت تو کفر کے ساتھ قائم رہ سکتی ہے۔ ظلم کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی۔

۱۶- فرمایا- نیت ہمیشہ ڈانواں ڈول رہا کرتی ہے اسی بنا پر بزرگوں نے کہا ہے کہ عمل خیر میں مصروف رہنا چاہیئے انشاء اللہ کبھی نہ کبھی نیت درست ہو جائے گی۔

۱۷- ایک شخص نے پوچھا- فرض نماز میں امام کو لقمہ دینا درست ہے یا نہیں۔

فرمایا— فقہا نے اس میں اختلاف کیا ہے صحیح تر یہ ہے کہ لقمہ دینا چاہیئے- اگر امام نے ایسی غلطی کی ہے جس سے معنی بدل رہے ہیں تو لقمہ دینا فرض ہے ورنہ مستحب

۱۸- ایک صاحب نے دریافت کیا کہ اعمال سفلی قوی التاثیر ہوتے ہیں اور بعض اعمال علوی ضعیف التاثیر پائے جاتے ہیں- اس کا کیا سبب ہے۔

فرمایا— شرع شریف میں اعمال سفلی سے جو منع کیا گیا ہے وہ اس بنا پر ہے کہ ان سے دین کو نقصان پہنچتا ہے- ان کی تاثیر سے انکار نہیں جیسے زہر کہ وہ ہے تو حرام مگر اس کی تاثیر ظاہر اور مسلم ہے۔

(تخریب کا عمل جلدی ہوتا ہے اور تعمیر دھیرے دھیرے)

۱۹- فرمایا— میرے دادا قوت نسبت اور کشف کے جامع تھے ایسے جامع اشخاص کم ہی ہوا کرتے ہیں جس کی نسبت قوی ہوتی ہے- اس کو کشف کم ہوتا ہے- اور جس کو کشف زیادہ ہوتا ہے اس کی نسبت کمزور ہوتی ہے- اصل چیز دل کا رنگین ہوتا ہے یہی چیز وقت مرگ اور بعد مرگ کام آئے گی۔

۲۰- ایک مُرید نے پوچھا اس زمانے میں مقامات فنا و بقا میں قوت کیوں نہیں؟

فرمایا— بارہا کہہ چکا ہوں- ہر زمانے کی ولایت اس زمانے کی سلطنت کے مثل ہوتی ہے

☆- اخلاق کی حقیقت یہ ہے کہ ہم سے کسی کو کسی قسم کی ایذائے ظاہری و باطنی حضور یا غیبت میں نہ پہنچے

☆ (ا-ع-ت)

بقیہ: اسرار التنزیل

تمازت سے پسینے کی لڑیاں ریت میں جذب ہو رہی تھیں۔ دیکھ کر کہنے لگا مسلمانوں کا امیر عادل ہے کہ اس طرح مزے سے لیٹا ہے ہمارے حکمران ظلم کرتے ہیں جو انہیں محلوں اور پہروں میں بھی سونے نہیں دیتا تو جب یہ حال ہے تو یہ غیر اللہ کی دوستی کا کیوں دم بھرتے ہیں دوستی کے لائق تو ذات باری ہے۔ اطاعت اسی کو سزاوار ہے حیا اسی سے ہونا چاہئیے۔ کیونکہ سب مُردہ ہیں اور وہ مردوں کو زندہ کرنے والا۔ سب محتاج ہیں اور وہ دینے والا جب ساری مخلوق اپنی تخلیق میں محتاج اور اپنی بقا اور زندگی کے لئے اس کے در پہ استادہ ہے تو مردوں سے دوستی کیا معنی دوستی تو اسی سے سزاوار ہے جو مُردوں کا زندہ کرنے والا ہے۔ یعنی نہ صرف خود زندہ ہے بلکہ ساری مخلوق کا زندہ کرنے والا ہے اور ہر چیز پہ قادر ہے۔ کسی معاملہ میں کسی کا محتاج نہیں۔ محتاج کی کیا دوستی کیا جانے وہ اپنی خواہشات اور آرزوئیں بھی پوری کر پاتا ہے یا نہیں دوستوں کو کیا دیگا لیکن مخلوق کے مقابلہ میں خالق ایسا نہیں ہے وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و علی آلہ و اصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین

بقیہ: دینِ اسلام کی تدوینِ نو

میں، ذلت میں اور محتاجی میں مبتلا کر دیا گیا۔ اور وہ اللہ کے بھیجے ہوئے غضب میں آ گئے۔

بنی اسرائیل کا یہ منصب اُمت مسلمہ کے سپرد ہوا تھا تاکہ آزمایا جائے کہ یہ نئی قوم کس حد تک اس وراثت کی اہل ثابت ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں بھی یہ وراثت زیادہ دیر راس نہ آئی۔ ہم نے بھی ہدایت ربانی سے روگردانی کی ہم نے بھی اللہ کی نعمتوں کی قدر نہ کی لہذا خدائی ضابطہ ہم پہ بھی صادق آیا اور ہم بھی نعمت خلافت سے محروم کر دیئے گئے چنانچہ اس کفران نعمت کے سبب اب ہم بھی یکسر ماتم و حسرت ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارا وجود بھی اللہ تعالیٰ کی زمین پر اب بار گراں بنتا جا رہا ہو۔

بقیہ: جراغ مصطفوی

یعنی تم اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرو جو انسان اپنے دشمن کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ اب انسان کا عمل دو قسم کا ہو سکتا ہے یا تو اپنی حفاظت کا اہتمام کرے۔ تاکہ انسانی شرف سے محروم نہ ہو یا اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے اور اسفل السافلین بن جائے۔ حفاظت کی تدبیر اللہ نے بتا دی کہ یاد کرو ایک ایسا محفوظ قلعہ ہے جہاں شیطان کی رسائی نہیں ہو سکتی اس کے مقابلے میں ذکر الہی سے غفلت گویا شیطان کے نام دعوت نامہ بھیجنا ہے غفلت کا شکار انسان یوں لگتا ہے جیسے مسلسل پکار رہا ہو آ بیل مجھے مار۔ انتخاب کرنا انسان کا اپنا کام ہے۔ چاہے تو اپنی حفاظت کرے چاہے تو دشمن کی گود میں چلا جائے پھر دشمن کے ہتھیار کی نشانہ بھی بھی نہ رادی کہ اس کا طریقۂ واردات یہ ہے کہ انسان کے قلب میں طرح طرح کے وسوسے ڈالتا ہے چنانچہ انسان کی سوچ کا رُخ اُلٹی سمت کو مڑ جاتا ہے انسان کی دلچسپیوں کا مرکز بدل جاتا ہے وہ غیر اللہ سے محبت کے رشتے جوڑنے لگتا ہے اور فانی کی محبت میں یہاں تک ترقی کر جاتا ہے کہ خالق سے اس کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے

اعاذنا اللہ منھا

(باقی آئندہ)

حافظ عبدالرزاق صاحب ایم اے

خدایا ایں کرم بارِ دگر کن

مدینہ طیبہ کو روانگی

وہاں چلو جہاں محبوبؐ نے دنیوی زندگی کے آخری دس برس گزارے اور جہاں اپنے دو شیدائیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے محو استراحت ہیں۔

چلنے سے اسی طرح پہلے بیت اللہ کو الوداعی سلام کہو پھر بصد ادب حضورؐ پر درود بھیجو۔

اللّٰھم صل علی محمد النبی الامی وعلی آلہ واصحابہ وبارك وسلم۔

تم نے درود پڑھا اچھا کیا، خوب کیا مگر اندر کی آواز پر کان لگاؤ کیا سنائی دیتا ہے؟

چوں بنام مصطفےٰ خوانم درود
از خجالت آب می گردد وجود
عشق می گوید کہ اے محکوم غیر
سینۂ تو از بتاں مانند دیر

گزری از محمد رنگ و بو

از درود خود میالای نام او

اُف کس قدر مایوس کن آواز ہے۔ یہاں یہ عالم ہے کہ محمدؐ کے رنگ و بو کے متعلق تو کوئی سوچتا ہی نہیں اور درود چیخ چیخ کر چلا چلا کر اور گا گا کر اور لاؤڈ سپیکر پہ پڑھنے پہ مصر کے ہو رہے ہیں یہ آواز تو اجنبی معلوم ہوتی ہے کہ

من احب سنتی فقد احبنی

زندگی کے ہر معاملے میں سنت کی مخالفت ہے اور محبت کے بلند بانگ دعوے ہیں۔

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد

مگر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ دیکھو آسمان کی بلندیوں سے آواز آ رہی ہے۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا

اس لئے اب تو وہاں جائے بغیر چارہ نہیں۔ یہ میل تو وہیں دھلے گا۔ یہ بوجھ تو وہیں جا کر اترے گا۔ اللہ کی صفت تواب اور رحیم کا کامل اظہار وہیں جا کر ہو گا اس لئے جاتے ہی عرض کر دینا:

یا شفیع المذنبین بارِ گناہ آوردہ ام

بر درت این بار با پشت دوتا آوردہ ام

چشم رحمت برکشا موئے سفید من نگر

گرچہ از شرمندگی روئے سیاہ آوردہ ام

من نمی گویم کہ بودم سالہا در راہ تو
ہستم آں گمراہ ، اکنوں رو براہ آوردہ ام

پیچھے قافلہ روانہ ہوا۔ اور یوں محسوس ہونے لگا کہ:

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

کوئی ۷۰ کلومیٹر چلے تو وادی عسفان میں پہنچے۔ پھر ۱۰۰ کلومیٹر پر ایک آبادی دکھائی دی یہ خلیص ہے یہ قصبہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ ایک بورڈ پر بلدیہ خلیص لکھا ہے۔ ۱۵۰ کلومیٹر پر ایک آبادی صعر کے نام سے آگئی اور ۱۸۰ کلومیٹر پر رابغ واقع ہے آس پاس حجر اور حارۃ الصلیب کی بستیاں ہیں، یہاں آکر جدہ سے مدینہ آنے والی سڑک مل جاتی ہے جوں جوں آگے بڑھتے ہیں احساس تیز تر ہو رہا ہے کہ دیارِ حبیب میں جا رہے ہیں کیوں؟

بایں پیری رہ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام
کشاید پر بفکرِ آشیانہ

۲۲۰ کلومیٹر چلنے کے بعد مستورہ پہنچے اور ۳۱۰ کلومیٹر چل چکے تو بدر پہنچ گئے۔ ہماری گاڑی میں کچھ نقص واقع ہو گیا اس لئے پیچھے تھے باقی قافلہ تین گاڑیوں میں مؤقف بدر پر ہمارا انتظار کر رہا تھا نمازِ ظہر پڑھی اور شہدائے بدر کی ملاقات کے لئے میدانِ بدر میں جانے کی تیاری کی مگر ہمارے سائق

(ڈرائیور) اکڑ گئے حالانکہ ان سے پہلے طے کر لیا تھا کہ شہدائے بدر کے پاس جانا ہے مگر وہ کسی طرح نہ مانے انہیں کیا خبر تھی کہ ہم کیوں وہاں جانا چاہتے ہیں پہاڑ کے اس خاص حصے میں کون سی کشش ہے اس کے دامن میں پھیلی ہوئی ریت کے ذرات میں کون سی جاذبیت ہے۔ ہم وہاں جا کر اس دریچے سے ماضی بعید کو ذرا جھانک کر ایک نگاہ دیکھنا چاہتے تھے۔ ہم اپنے اسلاف، کے ان نقوش پا کو دیکھنا چاہتے تھے جو ان ذرات پر وہ لوگ ثبت کر گئے تھے ہوائیں چلیں۔ جھکڑ آئے۔ طوفان اٹھے۔ بارشیں ہوئیں تو کیا اب تک وہ نقوش موجود ہوں گے مادیات کو دیکھنے کی عادی آنکھیں واقعی انہیں نہیں پا سکیں گی مگر وہ لوگ تو اعلان کر کے گئے تھے کہ:

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اس لئے ان قدسی نفوس کے قدم جہاں پڑے۔ ان کے مقدس وجود جہاں زخم کھا کر گرے ان سے یقیناً وہ لازوال انوار اب تک، اٹھ رہے ہونگے مگر:

جو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

بہر حال ہم سمجھ گئے کہ قریش مکہ کی سنگدلی بھی قانون توارث کے تحت منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے۔ لہٰذا یہ حسرت لے کر آگے بڑھے اور ہمارے موٹر فراٹے بھرتے ہوئے عصر کے قریب نواح مدینہ میں پہنچے۔ دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔

شہ کونین کے دربار میں جا رہے ہیں، اس دربار کے آداب خود خالق

کائنات نے سکھائے ہیں بیٹھنے کے آداب، گفتگو کے آداب، کچھ عرض کرنے کے آداب، مجلس سے اٹھ کر جانے کے آداب۔ غرض وہاں تو ادب ہی ادب ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا
تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا
تَشْعُرُوْنَ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ
وَلَوْ اَنَّھُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْھِمْ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَھُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ
امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی

قَدْ یَعْلَمُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْکُمْ لِوَاذًا
فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖٓ اَنْ تُصِیْبَھُمْ فِتْنَۃٌ اَوْ یُصِیْبَھُمْ
عَذَابٌ اَلِیْمٌ

کتنا عالی دربار ہے۔ کیسی نزاکت کا معاملہ۔ کس قدر احتیاط لازم ہے؟

اور ادھر یہ حال ہے کہ رفع صوت سے ممانعت کے باوجود اپنی بات کو نبی کی بات پر ترجیح دینے کا سودا ہے۔

اور اپنے نفس کے داعیہ کی تسکین کے لئے چیخ چیخ کر اور چلا چلا کر پکارنے کا جنون سوار ہے اور گانے کی رسیا طبیعتیں بھیروی وادرا کدارا اور مالکونس میں خطاب کرنے کی عادی ہیں۔

الٰہی! تیری مدد درکار ہے۔ ورنہ کہیں ہم ناکارہ جھولیاں بھر کے لانے کی بجائے دامن جھاڑ کے نہ اٹھیں۔

لو اب موڑ دائیں مڑا ہے۔ گنبدِ خضرا کی جھلک نظر آئی۔

الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ

الصلوٰۃ والسلام علیک یا حبیب اللہ

الصلوٰۃ والسلام علیک یا رحمۃ اللعالمین

الصلوٰۃ والسلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ساتھی پہنچ چکے ہوں گے۔ ہماری گاڑی مشینی نقص کی وجہ سے پیچھے رہ گئی۔ لہٰذا ہم نے باب عبدالمجید کے سامنے گاڑی روکی۔ اترے، ساتھی انتظار میں تھے نمازِ عصر ہو رہی تھی۔ جماعت میں شریک ہوئے۔ بعد نماز فوراً ہی روضۂ اطہر پر حاضری کا شوق تھا مگر آداب کی رعایت نے کچھ دیر اور انتظار کرنے پر مجبور کیا۔ مکان تلاش کیا۔ سامان رکھا۔ غسل کیا۔ لباس بدلا۔ چونکہ حضورؐ کو سفید لباس بہت پسند تھا اس لئے سب ساتھی سر تا پا سفید لباس زیبِ تن کئے مسجدِ نبوی کی طرف بڑھے۔ باب السلام کی طرف سے مواجہہ شریف کے سامنے آکر کھڑے ہوئے۔ پورے آداب سے سلام عرض کیا۔ پھر یہی کہ؂

شہسوارا کیمہ، نفس درکش عنان

حرفِ من آساں نہ آید بر زبان

آرزو آید کہ ناید تا بہ لب؟

می نگردد شوقِ محکوم ادب،

آں بگوید لب کشا اے دردمند
ایں بگوید چشم بکشا لب ببند
گرد تو گردد حریم کائنات
از تو خواہم یک نگاہِ التفات

آخر زبان بے زبانی سے یا یوں کہئے کہ دلی زبان سے عرض کر دیا۔

خواجہ من نگہدار آبروئے گدائے خویش
آنکہ ز جوئے دیگراں پر نکند پیالہ را

پھر ثانی اثنین فی الہجرۃ، فی الغار و فی القبر کے سامنے کھڑے ہو کر سلام عرض کیا۔

پھر امیر المومنین عمر فاروق خلیفہ ثانی کے سامنے کھڑے ہو کر سلام عرض کیا پھر لوٹ کے حضورؐ کے سامنے کھڑے ہو کر زبان بے زبانی سے حالِ دل کہنے کے لئے مراقب ہوئے۔ محبت کی مجبوری اور ہیبت بڑی مجبوری یہ ہے کہ زبان نہیں رکھتی رب العالمین کے سامنے دعا کی اور آگئے۔ بڑے باب جبریل کے سامنے سے گزرتے ہوئے حضورؐ کی پائنتی کے قریب پہنچے تو عجیب رقت طاری ہوئی۔

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم
من و تو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفے بر مرادِ دل بگوئیم
بپائے خواجہؐ چشماں را بمالیم

عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر آرام کیا. نماز صبح کے بعد سلام پیش کرنے مواجہہ شریف کے سامنے حاضر ہوئے گھر آئے تو عزیزہ غلام مصطفےٰ انجینئر کی طرف سے بلاوا آیا. عزیز جھنگ کے رہنے والے ہیں یہاں ینبوع میں انجینئر کے طور پہ کام کرتے ہیں، میں ان کے مل گیا اُن کے بھائی عزیزہ ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب سے بھی ملاقات ہوئی انہوں نے کہا کہ مجھے شام کو واپس ینبوع جانا ہے لہٰذا آج بعد دوپہر آپ کو اپنی گاڑی پر بعض مقامات کی زیارت کے لئے لے جاؤں گا چنانچہ ظہر کے بعد گاڑی لے کے آگئے اور ہم تمام ساتھی مضافات دیارِ حبیب دیکھنے چلے۔

مسجد قبلتین

تحویل قبلہ کا حکم آنے سے پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے. جب تحویل کعبہ کا حکم نازل ہوا. تو ایک صحابی جو اس مسجد کے پاس سے گزرے نماز باجماعت ہو رہی تھی انہوں نے خبر دی کہ قبلہ بدل چکا ہے نماز کی حالت میں ہی رخ بدل لیا گیا. لہٰذا اسے مسجد قبلتین کہتے ہیں یہ مسجد اعلان ہے اس بات کا کہ :

۱۔ صحابہ کے اندر اتباع نبوی کا جذبہ اتنا کامل طور پہ موجود تھا. کہ ادھر حضور کا حکم سنا ادھر تعمیل کر دی.

۲۔ صحابہ میں دعوتِ دین کا شغف اس قدر تھا جس کو جتنا علم ہوتا وہ اسے آگے پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے.

۲۰ مولانا قسم لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ خبر واحد ہرگز قابلِ اعتماد نہیں اس مسجد کا وجود ان کے منہ پر گویا زور کی چپت ہے کہ خبر واحد پر اعتبار نہ ہوتا تو جماعت نماز میں رُخ بدلتا نہ اسے مسجد قبلتین کہتے۔

مگر کچھ لوگ ایسے ضدی ہوتے ہیں کہ چپت کھا کر بھی اپنی ضد سے باز نہیں آتے چنانچہ "معراج انسانیت" کی نشاندہی کرنے والے تاریخی حقائق سے آنکھیں بند کر دینے پر مطمئن نہ ہوئے تو قرآن حکیم کی تحریف کو مشغلہ بنا لیا چنانچہ

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا

کا ترجمہ کرتے ہیں۔

یہ وہ لوگ جہالت و نادانی کی بناء پر اعتراض کریں گے کہ جب ان کا دیو والیوں کا، قبلہ بیت المقدس چلا آرہا تھا تو مسلمانوں نے اسے چھوڑ کر کعبہ کو اپنا قبلہ کیوں بنایا ہے۔

یہ ہے خشتِ اوّل اب اس کے بعد دیوار کی کجی ملاحظہ ہو۔

قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۖ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا کا

ترجمہ لکھتے ہیں۔

ہمیں اس کا علم ہے کہ تمہارے دل میں یہ آرزو بار بار ابھر رہی ہے کہ جس مقام (کعبہ) کو ہمارے نظام کا مرکز قرار دیا گیا ہے اس پر قبضہ اور تصرف بھی ہمارا ہی ہونا چاہیئے یہ ٹھیک ہے ایسا ضرور ہو کر رہے گا پھر

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا۔

اور جس قبلہ کی طرف تم رُخ کئے ہوئے ہوا سے ہم نے اس لئے قبلہ

بنا دیا ہے ......؟

یعنی تحویل قبلہ محض افسانہ ہے عجمی سازش ہے اور یار لوگوں نے اس عجمی سازش کی تکمیل کے لئے مسجد قبلتین جھوٹ موٹ تعمیر کر لی ہے۔

زیاد ذا فرنگ و دل آویزئ افرنگ — زیاد ز شیرینی و پرویزئ افرنگ

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ

بئر عثمانؓ

مہاجرین نے جب مدینہ کو اپنا وطن بنایا تو ایک عمومی مشکل یہ پیش آئی کہ مدینہ کے تمام کنوئیں کھاری تھے۔ صرف ایک بیئر رومہ شیریں تھا مگر یہ ایک یہودی کی ملکیت میں تھا اور یہودیوں کو مسلمانوں کے ساتھ جو دلی دشمنی تھی اس کے اظہار کا یہ ایک عمدہ بہانہ تھا۔ کہ وہ اپنے کنوئیں سے مسلمانوں کو پانی نہ لینے دیں اور اس طرح دشمنی کا حق ادا کر سکیں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے ۲۰ ہزار درہم میں یہ کنواں خریدا اور مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اپنا انعام بیان فرماتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ

یعنی پانی اور حیات کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ پانی کے بغیر حیات نہیں گویا یہ حضرت عثمانؓ ہی تھے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کے لئے حیات کا سبب بنایا مگر چشم فلک نے وہ مخلوق بھی دیکھی ہے جو اسلام کی خاطر سب کچھ لٹا

دینے والے اس محسن کو ملزم کے کٹہرے میں کھڑا کر کے اس پر ٹوٹنے کی فردِ جرم لگا رہے ہیں:

چنیں دورِ آسماں کم دیدہ باشد

اس کنویں کے قدیم آثار موجود ہیں پاس ہی ٹیوب ویل بھی لگا ہوا ہے گیٹ کے پاس کھلی جگہ پر ایک نوجوان لٹکی ننگے سر سینہ تان کر کیمرہ کے سامنے کھڑی ہے بوڑھا باپ پاس کھڑا ہے یہ عمرہ کے لیے آئے ہوں گے واپس جا کر سند کے طور پر یہ فوٹو اپنے احباب کو دکھائیں گے۔

بریں ذہن و دانش بباید گریست

وفیات:

ہمارے مندرجہ ذیل رفقاء دارِ فنا سے دارِ بقا کو سدھار گئے

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

قارئین سے درخواست ہے کہ ان کے لیے دعاءِ مغفرت کریں۔

(۱) صوفی محمد مسکین صاحب کراچی کے والد محترم

(۲) حافظ عظمت اللہ صاحب راولپنڈی

(۳) پروفیسر ساجد محمود صاحب اٹک